یادگار : شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
ماہ نامہ
ہمدرد نونہال
خاص نمبر
اشاعت کا ۶۳ واں سال
صدرِ مجلس
سعدیہ راشد
مدیرِ اعلا
مسعود احمد برکاتی
شمارہ ۶
جلد ۶۳
جون ۲۰۱۵ عیسوی
شعبان المعظم ۱۴۳۶ ہجری
قیمت خاص نمبر
۵۰ رُپے
قیمت عام شمارہ
۳۵ رُپے
سالانہ (عام ڈاک سے)
۳۸۰ رُپے
سالانہ (رجسٹری سے)
۵۰۰ رُپے
سالانہ (دفتر سے دستی لینے پر)
۳۴۰ رُپے
سالانہ (غیر ممالک سے)
۵۰ امریکی ڈالر
دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰
سعدیہ راشد پبلشر نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی سے شائع کیا
سرورق کی تصویر
آریانہ لالی، نیویارک
ISSN 02 59-3734

خاص نمبر میں کیا کیا ہے؟

ٹیلے فون — 36620945 — 36620949
36616001 — 36616004
ایکسٹینشن — (054 یا 052 یا 066)
ٹیلے فیکس نمبر — (92-021) 36611755
ای میل — hfp@hamdardfoundation.org
ویب سائٹ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان — www.hamdardfoundation.org
ویب سائٹ ہمدرد لیبارٹریز (وقف) — www.hamdardlabswaqf.org
ویب سائٹ ادارۂ سعید — www.hakimsaid.info
فیس بک پیج — www.facebook.com/Hamdardfoundationpakistan

"ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آئندہ ہمدرد نونہال کی قیمت صرف
بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابل قبول ہوگی، VPP بھیجنا ممکن نہیں ہے۔"

قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کا احترام ہم سب پر فرض ہے

ہمدرد نونہال خاص نمبر جون ۲۰۱۵ عیسوی

مونا کا گاؤں

منظر عارفی

۶۹

ایک پُرعزم لڑکی کی سبق آموز کہانی، جس نے گاؤں کا نقشہ ہی بدل دیا

چھینک کی دہشت

ثمینہ پروین

۱۷۴

اسے علاج کے لیے ایک ہزار سال بعد کے زمانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ سائنسی کہانی

بلاعنوان انعامی کہانی

محمد فاروق دانش

۱۸۷

اس معاشرتی کہانی کا عنوان بتا کر ایک اچھی سی کتاب حاصل کیجیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
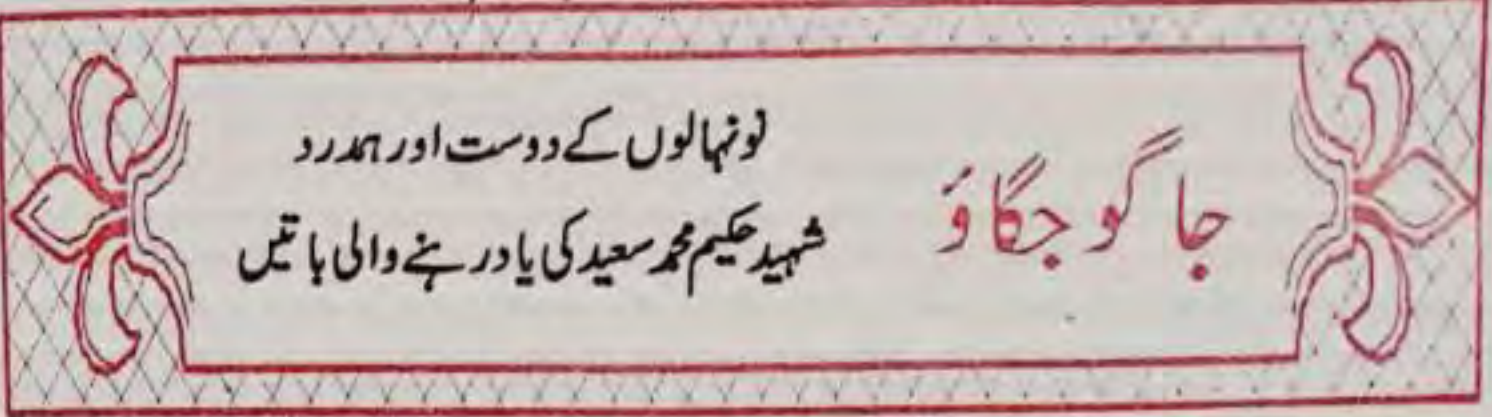
اچھے کام کر کے دل خوش ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ تعریف بھی وہی لوگ کرتے ہیں جو اچھے کام کی قدر کرتے ہیں۔ اچھے کام کی تعریف کرنا اصل میں اچھے کام کرنے والوں کی مدد ہے۔ جن لوگوں کو اچھے کاموں کی قدر نہیں، وہ اچھے کام کرنے والوں کو اچھا نہیں کہتے۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ اپنے بھائیوں کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہوں یا مظلوم۔ آپؐ کے ساتھیوں (صحابۂ کرامؓ) کو آپ کا یہ ارشاد سن کر حیرت ہوئی کہ مظلوموں کی مدد تو ٹھیک ہے، لیکن ظالم کی مدد کیوں کی جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ظالموں کی مدد یہ ہے کہ انھیں ظلم سے روکا جائے۔ آپؐ کے اس فرمان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارا صرف یہی فرض نہیں ہے کہ اچھے کام کرنے والوں کی تعریف کریں، مدد کریں، بلکہ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ بُرے اور غلط کام کرنے والوں کو بُرائی سے روکیں، ان کو ڈرائیں۔ ان سے خوشی کا اظہار نہ کریں۔ ان کی مدد نہ کریں۔

آج جو بُرائیاں پھیل رہی ہیں، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم بُرا کام کرنے والوں کو نہیں روکتے۔ ان کو نہیں سمجھاتے، بلکہ ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ کس طرح؟ ہم ان کی مدد اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے بُرے کاموں کو بُرا نہیں کہتے۔ ان سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ ان کی عزت کرتے ہیں۔

قرآن حکیم ہمیں حکم دیتا ہے کہ نیکی اور خیر کے کاموں میں تعاون کرو، گناہ اور ظلم کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ اگر ہم سب اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرنے لگیں تو ہماری زندگی کتنی اچھی، کتنی آسان ہو جائے۔ اس کے بعد کوئی شخص بُرائی کرنے کی ہمت نہ کرے۔ اگر اتفاقاً کسی سے کوئی بُرا کام ہو بھی جائے تو وہ شرم کے مارے کسی کو اپنا منھ نہ دکھائے، لوگوں کے سامنے آنے سے ڈرے، لیکن آج یہ صورتِ حال ہے کہ بُرے اور غلط کام کرنے والے بڑی ڈھٹائی سے دندناتے پھرتے ہیں۔ ان حالات کی اصلاح صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ہم اچھے کام کرنے والوں کی تعریف اور مدد کریں، ان کا حوصلہ بڑھائیں اور بُرے کام کرنے والوں کو سمجھا کر صحیح راستے پر لانے کی کوشش کریں۔

(ہمدرد نونہال جون ۱۹۹۱ء سے لیا گیا)
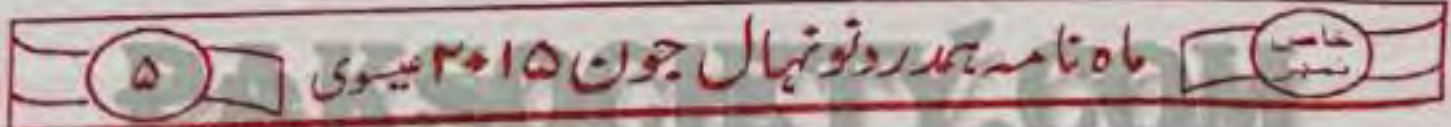
پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

خاص نمبر پیش ہے۔ آپ بتائیے کیسا ہے؟ مجھے تو یہ اطمینان ہے کہ سب کو پسند آئے گا اور میری ہمت افزائی کریں گے۔ اسی اُمید میں تو طبیعت خراب ہونے کے باوجود محنت کی ہے۔ اپنی صلاحیت اور تجربے کو پوری طرح کام میں لانے کی کوشش کی ہے۔

ادیب اور شاعر دوستوں نے بھی اپنی اچھی سے اچھی تخلیقات عنایت کیں اور خاص نمبر کو واقعی خاص بنانے میں شرکت فرمائی۔

ہماری صدر محترمہ سعدیہ راشد بھی حسب عادت دل سے ہماری شریک رہیں اور مشوروں سے بھی نوازتی رہیں۔

اس بار بھی خاص نمبر کے ساتھ تحفہ ہے۔ ایک دل چسپ اور مفید کتاب کا تحفہ ہے، یہ تحفہ محترم ڈاکٹر نوید الظفر صاحب کی عنایت سے ہمدرد وقف کی جانب سے ہے۔

میرے ساتھی بھی مسلسل شریکِ کار رہے۔

سلیم فرخی بھی ہر قدم پر ساتھ ہیں۔ جدون ادیب، محمد اکرم وارثی، عبدالجبار خاں نے بھی دل لگا کر کام کیا۔ فیصل علی بھی رات دن بھاگ دوڑ میں رہے۔ شکریہ، شکریہ، شکریہ۔

☆☆☆

سونے سے لکھنے کے قابل زندگی آموز باتیں

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جو شخص مسلمان کا حق مارے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جہنم کو واجب کر دیا۔

مرسلہ : علی حیدر لاشاری، لاکھڑا

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ

انسان کو اچھی نیت پر وہ انعام ملتے ہیں، جو اچھے اعمال پر بھی نہیں ملتے، کیوں کہ نیت میں دکھاوا نہیں ہوتا۔ مرسلہ : محمد شاہد کھتری، کراچی

جلال الدین رومی

اپنی آواز کے بجائے اپنے دلائل کو بلند کریں، پھول بادل کے گرجنے سے نہیں، بلکہ برسنے سے اُگتے ہیں۔ مرسلہ : زینب ناصر، فیصل آباد

شیخ سعدیؒ

خدا کو زبان کی سختی پسند نہیں ہے، شاید اسی لیے زبان میں ہڈی نہیں ہے۔ مرسلہ: محمد سہیل نواب، ٹنڈو الہیار

شہید حکیم محمد سعید

کام یابی، ایک حصہ ذہانت اور نو حصے محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ مرسلہ : عرشیہ نوید، کراچی

جبران خلیل جبران

ایک دفعہ میں خاموش ہونے پر مجبور ہو گیا، جب ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟

مرسلہ : کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

بقراط

خامیوں کا احساس کام یابی کی کنجی ہے۔

مرسلہ : روبینہ ناز، کراچی

ایمرسن

جوش اور ہوش بہت کم یکجا ہوتے ہیں، لیکن جس میں یہ دونوں اوصاف ہوں، اس سے کبھی لغزش نہیں ہوتی۔ مرسلہ : وجیہ متین، نارتھ کراچی

شیکسپیئر

بہادر لوگ ہی شہرت اور ناموری حاصل کرتے ہیں۔ مرسلہ : قمر ناز دہلوی، کراچی

لینن

ذاتی لائبریری انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ مرسلہ : سیدہ اریبہ بتول، لیاری ٹاؤن

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ضیاء الحسن ضیاؔ

آپؐ کا نام ہے لبوں پہ حضورؐ
آ رہا ہے دل و نظر کو سُرور

آپؐ نے کردیا معاف اُسے
جس سے سرزد ہوا ہے کوئی قصور

آپؐ کی یاد بس گئی دل میں
ساری دنیا ہوئی ہے دل سے دور

ہے جمالِ رسولؐ کا صدقہ
دل پہ نازل ہوا ہے نور ہی نور

کُفر کی ظلمتیں لرزنے لگیں
رحمت پاکؐ کا ہوا جو ظہور

سب مسلمان بھائی بھائی ہیں
رہے پیشِ نظر یہ قولِ حضورؐ

میرے دل کو یقین ہے یہ ضیاؔ
درِ اقدس پہ جاؤں گا میں ضرور

پڑوسی

مسعود احمد برکاتی

وہ آدمی جن کے گھر ایک دوسرے کے قریب ہوں، پڑوسی کہلاتے ہیں۔ ان کو "ہم سایہ" بھی کہتے ہیں۔ ہم سایہ کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دونوں اتنے قریب ہیں کہ ان میں سے دونوں کا سایہ ایک دوسرے پر پڑتا ہے یا دونوں کا سایہ ایک ہی ہوتا ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ "ہم سایہ ماں جایا" یعنی دو پڑوسی ایک ہی ماں کی اولاد کی طرح ہوتے ہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ کسی کا بھائی یا قریبی رشتے دار اگر دور رہتا ہے تو وہ وقت، بے وقت اتنا کام نہیں آسکتا جتنا پڑوسی کام آسکتا ہے۔ اچھے اور اعلا اخلاق کے پڑوسی آپس میں ایک دوسرے کا پورا خیال رکھتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، تکلیف کا خیال رکھتے ہیں، ایک دوسرے کو تحفے دیتے ہیں۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے دو پڑوسی ہیں۔ میں ان میں سے کس کے پاس تحفہ بھیجوں؟"

سرکارؐ نے فرمایا: "ان میں سے جس کے گھر کا دروازہ تمھارے گھر سے زیادہ قریب ہو۔"

اچھا پڑوسی اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک اچھا انسان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں سے بہتر ساتھی وہ ہے، جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے، جو اپنے اور پڑوسی کے لیے بہتر ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضورؐ کی خدمت میں

عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کیسے معلوم ہو کہ میں اچھے کام کر رہا ہوں یا بُرے کام کر رہا ہوں؟''

حضورؐ نے فرمایا: ''جب تم اپنے پڑوسی کو یہ کہتے سنو کہ تم اچھے کام کر رہے ہو تو واقعی تم اچھے کام کر رہے ہو۔''

حضورؐ کے زمانے میں ایک خاتون تھیں۔ وہ رات بھر نمازیں پڑھا کرتی تھیں، دن کو روزے رکھتی تھیں، صدقہ اور خیرات بھی بہت کرتی تھیں، مگر زبان کی تیز تھیں، پڑوسی ان کی زبان سے خوش نہ تھے۔ لوگوں نے حضورؐ سے ان کا حال عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''ان میں کوئی نیکی نہیں ہے، ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔'' پھر حضورؐ کے ساتھیوں نے ایک دوسری خاتون کا حال سنایا، جو صرف فرض نماز پڑھ لیتی تھیں، معمولی صدقہ دے دیتی تھیں، مگر کسی پڑوسی کو ستاتی نہیں تھیں تو حضورؐ نے فرمایا: ''وہ عورت جنت میں جائے گی۔''

پڑوسی سے اچھے تعلقات رکھنا، اس کے کام آنا، اس کی عزت کرنا بڑی خوبی ہے اور ان باتوں کا شمار اعلا اخلاق اور شرافت میں ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے پڑوسی سے محبت نہ کرے، وہ اچھا انسان نہیں ہے، بلکہ اس کا ایمان چھن جانے کا بھی خطرہ ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی مومن نہ ہوگا، جب تک اپنے پڑوسی کی جان کو اتنا پیارا نہ رکھے، جتنا اپنی جان کو پیارا رکھتا ہے۔''

سرکارؐ نے پڑوسی کی محبت کو اللہ اور رسولؐ کی محبت حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اس کو پیار کریں، یا جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کا دعوا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔''

پڑوسی کے ساتھ اچھے برتاؤ کی اس حد تک اہمیت ہے کہ اگر تمھیں پڑوسی سے کوئی شکایت ہو تو جواب میں تم بھی اس کے ساتھ برائی نہ کرو، بلکہ اپنے اچھے اخلاق سے اس کو صحیح راستے پر لانے اور اچھا پڑوسی بنانے کی کوشش کرو۔ تمھارے اچھے برتاؤ سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور وہ بھی اچھا پڑوسی بن سکتا ہے۔

ایک بار ایک صحابی نے حضورؐ سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جاؤ، صبر کرو۔'' وہ صحابی پھر وہی شکایت لے آئے تو آپؐ نے پھر صبر کی نصیحت فرمائی۔ وہ پھر آئے اور اپنی شکایت دہرائی۔ آپؐ نے فرمایا: ''جا کر اپنا سامان راستے میں ڈال دو۔'' (گویا یہ ظاہر ہو کہ تم گھر چھوڑ رہے ہو) ان صاحب نے حضورؐ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ آنے جانے والوں نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' ان صاحب نے واقعہ بتایا۔ سب لوگوں نے ان کے پڑوسی کو بُرا بھلا کہا۔ اب وہ پڑوسی شرمندہ ہوا اور ان صاحب کو منا کر گھر واپس لایا اور وعدہ کیا کہ آیندہ انھیں نہیں ستائے گا۔

ایک مسلمان پڑوسی کو تو اور زیادہ اچھا ہونا چاہیے۔ شرافت، مروت، رواداری، خدمت گزاری مسلمان کی صفات ہیں۔ ایک مسلمان پڑوسی کو دوسروں کے مقابلے میں اچھا پڑوسی ہونا چاہیے اور اپنے پڑوسی کا ہر طرح، ہر وقت خیال رکھنا چاہیے۔ اگر ایک مسلمان کا پڑوسی بھوکا ہو تو اُسے بے پروا نہیں ہونا چاہیے۔ سرکارؐ کا ارشاد ہے:

''مومن وہ نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔''

حضرت ابوذرؓ سے حضورؐ نے فرمایا: اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو

اور اس سے اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔''

ایک دن حضورؐ اپنے ساتھیوں کے مجمع میں تشریف رکھتے تھے۔ آپؐ نے ایک خاص دل نشیں انداز میں فرمایا: ''اللہ کی قسم، وہ مومن نہ ہوگا، اللہ کی قسم، وہ مومن نہ ہوگا، اللہ کی قسم، وہ مومن نہ ہوگا!''

صحابہ نے پوچھا: ''کون یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟''

فرمایا: ''وہ جس کا پڑوسی اس کی شکایتوں سے محفوظ نہ رہے۔''

پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ کون ہے، اس کا مذہب یا طریقہ کیا ہے۔ پڑوسی چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس کے ساتھ محبت اور عزت کا رویہ رکھنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک بار بکری ذبح کی۔ ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا۔ حضرت عبداللہ نے اپنے گھر والوں سے پوچھا کہ تم نے اپنے یہودی پڑوسی کو بھی حصہ بھیجا، کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مجھے جبریلؑ پڑوسی کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس پڑوسی کو ترکے کا حصے دار بنا دیں گے۔

پڑوسیوں کو تحفے دینا بھی محبت اور تعلق میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے، اس لیے حضورؐ نے پڑوسیوں کو تحفہ دینے کی نصیحت بھی فرمائی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ تحفے کے لیے کوئی بہت بڑی اور اعلا چیز ضروری نہیں ہے۔ معمولی چیز بھی تحفے میں دی جا سکتی ہے۔ تحفہ دینے والے کو بھی اور تحفہ لینے والے کو بھی معمولی سے معمولی تحفے کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ خوش ہو کر تحفہ لینا چاہیے۔ حضورؐ بھی تحفہ خوشی سے قبول فرمایا کرتے تھے۔

☆☆☆
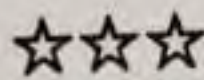
ماہِ رمضان کی آمد

محمد مشتاق حسین قادری

رمضان آ رہا ہے ، رمضان آ رہا ہے
خوش آمدید کہیے ، مہمان آ رہا ہے
ماہِ کرم بفضلِ رحمان آ رہا ہے
لے کر یہ رحمتوں کا سامان آ رہا ہے
پلکیں بچھاؤ اس کی راہوں میں والہانہ
بن کر یہ بخششوں کا امکان آ رہا ہے
جس میں اُتاری رب نے اپنی کتابِ اطہر
ہاں ، ہاں وہی مہینا ذیشان آ رہا ہے
کتنے غموں کا اب تک ڈیرا لگا تھا دل میں
صد شکر ، سب غموں کا درمان آ رہا ہے
رحمت کے وا ہوتے ہیں مشتاقؔ سب دریچے
بن کر وعیدِ باغِ رضوان آ رہا ہے

عمل شرط ہے

اُمِ عادل

دنیا میں جتنی بھی نامور شخصیات گزری ہیں، اُن سب کی کام یابی اور ناموری کا سبب وقت کی پابندی اور اپنے خیالات پر بہترین عمل ہی ہے۔ آپ ذہن میں چاہے جتنے اچھے، خوب صورت اور فائدہ مند منصوبے ترتیب دے لیں، مگر بروقت ان پر عمل نہ کریں تو سب لاحاصل اور بے کار ہوگا۔ آپ نے مشہور ادیب اشفاق احمد صاحب کا نام تو سنا ہوگا۔ اشفاق احمد صاحب ہمارے ملک کی نامور علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ میں سنہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں چین گیا۔ وہاں میں نے اس وقت کے صدر ماؤزے تنگ سے ملاقات کی اور کہا کہ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ہم پاکستانیوں کے بعد آزادی ملی، مگر آپ نے اتنی ترقی کس طرح کرلی؟ کچھ ہمیں بھی بتائیے۔

ماؤزے تنگ نے فرمایا: ''ہر ملک و قوم ترقی پذیر کی فہرست سے نکل کر ترقی یافتہ بننا چاہتی ہے، مگر یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اُس ترقی کو پانے کے لیے عمل کی رفتار تیز تر ہو۔ ہر فرد اور قوم کہتی ہے، ہماری زندگی میں یا ملک میں یہ ہونا چاہیے، مگر یہ ''چاہیے'' صرف آرزو کی حد تک رہتا ہے۔ وہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ ہمارے ملک چین کی ترقی کا راز یہ ہے کہ چینی قوم جب ملک کی ترقی و بہتری کے لیے کوئی ضرورت محسوس کرتی ہے اور سوچتی ہے کہ یہ ہونا چاہیے تو پھر ہماری حکومت و قوم اُس سوچ کو وہیں نہیں چھوڑ دیتے،

بلکہ اُسے لے کر عملی اقدامات کی طرف یوں بڑھتے ہیں کہ پہلے ہم اس ضرورت کو پورا کرنے سے متعلق اپنے وسائل کا جائزہ لیتے ہیں، پھر اُس پر عمل کا ایک طریقہ کار وضع کرتے ہیں اور پوری قوم عمل کے لیے کمر بستہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کچھ ہی دنوں یا مہینوں بعد ہماری وہ سوچ جو ''چاہیے'' سے شروع ہوئی تھی، نہ صرف عملی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہوتی ہے، بلکہ ہماری قوم اُس سے مستفید بھی ہو رہی ہوتی ہے۔''

جس طرح قائداعظم محمد علی جناح ہم پاکستانیوں کے رہنما اور عظیم لیڈر ہیں، اپنی بے مثال محنت و جرأت سے پاکستان حاصل کر کے بانی پاکستان کہلاتے ہیں، بالکل اسی طرح جناب ماؤزے تنگ چینی قوم کے بے مثل اور نڈر لیڈر تھے، جنھوں نے چینی قوم کو اپنی بھرپور قائدانہ صلاحیتوں اور جدوجہد سے آزادی کی دولت دلوا کر آزاد قوموں کی صف میں کھڑا کیا۔ یعنی ماؤزے تنگ اپنی قوم کے قائداعظم ہیں۔ اشفاق صاحب کے سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا تھا، وہ سنہری حروف لکھنے کے قابل ہے۔ ☆

ڈاکٹر: ''آپ کا وزن کتنا ہے؟''

مریض: ''جناب! چشمے کے ساتھ ۷۵ کلوگرام ہے۔''

ڈاکٹر: ''اور چشمے کے بغیر کتنا ہے؟''

مریض: ''چشمے کے بغیر مجھے نظر ہی نہیں آتا۔''

مرسلہ : کومل فاطمہ اللہ بخش، لیاری، کراچی

امام غزالیؒ

شہید حکیم محمد سعید

دنیاے اسلام کے مشہور عالم اور محقق ہیں۔ غزالی کا پورا نام ابو حامد محمد ہے۔ وہ خراسان کے علاقے طوس کے ایک گاؤں میں ۱۰۵۹ء میں پیدا ہوئے۔

غزالیؒ بچپن میں بہت ذہین تھے۔ وہ جُرجان کے ایک بڑے عالم ابونصر کی خدمت میں علم حاصل کرنے کے لیے پہنچے۔ اس زمانے میں کتابیں آسانی سے نہیں ملتی تھیں۔ استاد ابونصر نے لیکچر کے ذریعے سے غزالی کو کچھ پڑھایا، انھوں نے اپنے استاد کی درسی تقریروں کا ایک نوٹ تیار کرلیا اور اب علم کی پیاس بجھانے کے لیے غزالیؒ نے نیشاپور کی ایک درس گاہ کی طرف رجوع کیا، جو تاریخ میں نظامیہ یونی ورسٹی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس یونی ورسٹی کے سب سے بڑے پروفیسر امام الحرمین تھے۔ غزالیؒ نے ان سے پڑھا اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔

غزالی جب یونی ورسٹی میں داخلے کے لیے ایک قافلے کے ساتھ جا رہے تھے تو ایک مقام پر ڈاکوؤں نے سارے قافلے والوں کا سامان چھین لیا۔ کسی کو دم مارنے کی ہمت نہ ہوئی، لیکن غزالیؒ بے خوف وخطر ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے کہا کہ میں طالب علم ہوں، میرا سارا سامان آپ لے لیں، مگر اپنے استاد کے لیکچرز کا جو نوٹ میں نے تیار کیا ہے، وہ دے دیں۔ وہ میری سب سے قیمتی پونجی ہے۔

ڈاکو ہنسا اور اس نے کہا: ''وہ علم بھی کیا ہے جو چند کاغذات کے گم ہو جانے سے ختم ہو جائے۔ میں نے تو سنا تھا کہ علم وہ خزانہ ہے جسے کوئی چور نہیں چُرا سکتا۔'' یہ کہہ کر ڈاکو نے آپ کے کاغذات واپس کردیے۔ غزالی کے دل پر اس ڈاکو کی بات کا ایسا اثر
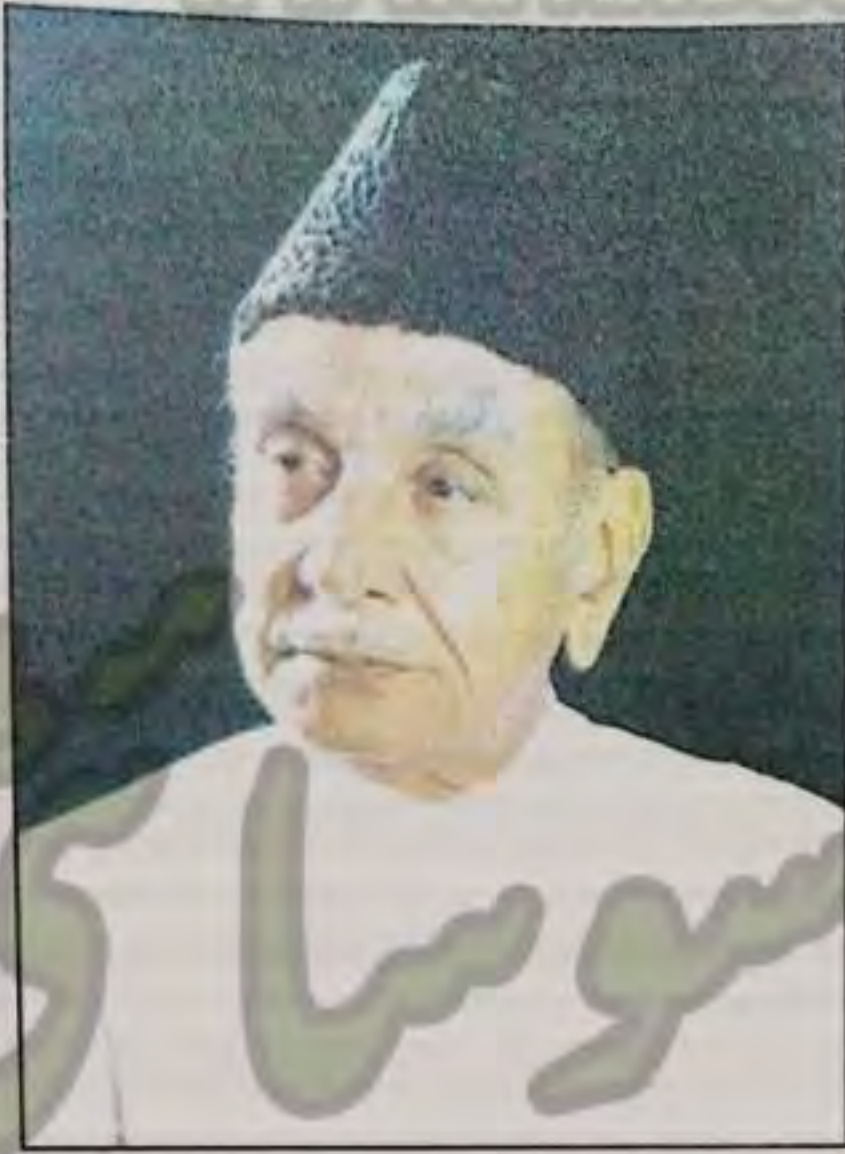
ہوا کہ انھوں نے راستے ہی میں سارے اسباق زبانی یاد کر لیے۔

نیشا پور کی نظامیہ یونی ورسٹی میں داخل ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے صرف ۳۴ سال کی عمر میں بغداد کی نظامیہ یونی ورسٹی میں پرنسپل ہو گئے۔ ذہانت اور اعلا درجے کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے دربار تک رسائی ہو گئی۔ نظام الملک طوسی نے انھیں اپنا مشیر بنا لیا۔ انھوں نے سیاست میں بھی حصہ لیا، شہرت اور ناموری بھی حاصل کی، لیکن انھیں احساس ہوا کہ انسان کے دل کو سکون اس وقت مل سکتا ہے، جب وہ اخلاقی برائیوں سے پاک ہو اور لوگوں کی سچی خدمت کرے۔

اس زمانے میں فلسفے کا بڑا زور تھا۔ اس کے اثر سے گمراہیاں پھیل رہی تھیں۔ لوگ مذہب سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ امام غزالیؒ نے بہت اہم اور تحقیقی کتابیں لکھیں اور زمانے کو فکری انتشار سے بچایا۔ وہ ایک جدید اسلامی فلسفے کے بانی ہوئے۔

غزالیؒ نے بہت سی کتابیں لکھیں، لیکن سب سے زیادہ مشہور کتاب احیاء العلوم الدین ہے، جو ایک ہزار سال پرانی ہونے کے باوجود اپنے علمی خزانوں کی وجہ سے آج بھی نئی معلوم ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ کا انتقال ۱۱۱۱ء میں ہوا۔ ☆

ڈھنڈورا

وقار محسن

ان کا نام رستم علی خاں تھا۔ پیٹ کے ہلکے تھے، یعنی کسی بات کو وہ راز نہیں رکھ سکتے تھے۔ اگر کسی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک یا نیکی کر بیٹھتے تو اس کا احسان جتانے کے لیے ڈھنڈورا بہت پیٹا کرتے تھے۔ ایک بار خاں صاحب کے پڑوسی جناب مرزا صابر علی بینک میں غبن کے الزام میں گرفتار ہو گئے۔ خاں صاحب کو جیسے ہی پتا چلا، وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر تھانے پہنچ گئے اور کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد ان کو چھڑانے میں کام یاب ہو گئے۔ مرزا صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ اس معاملے کا کسی سے ذکر نہ کریں، لیکن خاں صاحب اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔

محلے میں ایک تقریب تھی اور تقریباً سب ہی محلے دار موجود تھے۔ کچھ دیر میں خاں صاحب گنگناتے ہوئے اس محفل میں پہنچے اور بیٹھتے ہی کہنے لگے: ''ارے صاحب! آج کل اخلاق نام کی کوئی چیز لوگوں میں نہیں رہی۔ کل یہ ہمارے مرزا صابر صاحب کے ساتھ اتنا افسوس ناک واقعہ ہوا اور محلے میں سے کوئی ان کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔''

لوگوں نے واقعے کی تفصیل پوچھی تو خاں صاحب کہنے لگے: ''ارے صاحب! یہ پولیس والے بھی ایسے سنگین الزامات بے سبب لگا دیتے ہیں۔ بھلا سوچیے، مرزا صاحب جیسے شریف آدمی پر غبن کا الزام لگا دیا۔ جیسے ہی یہ بات میرے علم میں آئی، میں فوراً پہنچ گیا اور کافی دوڑ دھوپ کے بعد ان کو رہا کرانے میں کام یاب ہو گیا۔'' یہ سنتے ہی مرزا صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ بے چارے خاموشی سے اُٹھ کر چل دیے۔

ایک واقعہ تو بہت ہی دل چسپ ہے۔ پچھلے دنوں خاں صاحب کے ماموں سادات نگر سے ان کے ہاں مہمان آئے۔ دو دن بعد خاندان میں ایک ولیمے کی تقریب تھی، جس میں ماموں موجود تھے۔ کچھ ہی دن پہلے خاں صاحب کو ان کے دوست نے مردان سے ان کے لیے نہایت نفیس مخمل کی کیپ بھیجی تھی، جو وہ خاص تقریبات میں استعمال کرتے تھے۔ تقریب کے دن خاں صاحب نے ماموں سے اصرار کیا کہ آج کی تقریب میں وہ ان کی ٹوپی ضرور پہنیں۔ ماموں نے سرخ پھولوں کی ریشمی شیروانی زیب تن کر کے سر پر وہ ٹوپی جمائی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھا اور دل ہی دل میں داد دی۔

ولیمے کی تقریب میں سب ہی قریبی رشتے دار موجود تھے اور خاں صاحب،

ماموں کا تعارف ہر کسی سے کروا رہے تھے۔ اپنے عزیز دوست سلیم احمد پر نظر پڑتے ہی خاں صاحب ماموں کا ہاتھ پکڑ کر سلیم صاحب کے قریب گئے اور ماموں کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے: ''سلیم صاحب! ان سے ملیے۔ یہ ہمارے ماموں حشمت علی خاں، سادات نگر کے نامور زمینداروں میں سے ہیں۔ بہت خوبیوں کے مالک ہیں۔ مہمان نوازی تو ان پر ختم ہے۔ اور ہاں، اچھے کپڑے پہننے کے شوقین ہیں، لیکن یہ جو شان دار ٹوپی پہنے ہوئے ہیں، یہ میری ہے۔''

ٹوپی والی بات سن کر ماموں بہت شرمندہ ہوئے اور خان صاحب کو ایک کونے میں لے جا کر ناراضگی سے بولے: ''میاں! تم نے تو حد کر دی چھچھورپن کی۔ بھلا یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ ٹوپی میری نہیں ہے، یعنی آپ نے تو حد کر دی۔''

خاں صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور اپنی غلطی تسلیم کی۔

کچھ دیر بعد مجمع میں گھومتے پھرتے خاں صاحب کو اپنے ایک اور دوست نظر آئے۔ وہ ماموں کا ہاتھ پکڑ کر ادھر لپکے۔

''شارق صاحب! ان سے ملیے، یہ ہیں ہمارے پیارے ماموں حشمت علی خاں۔ سادات نگر کی نامور شخصیت ہیں۔ زمینداری کے علاوہ ان کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار بہت وسیع ہے اور ہاں، یہ جو ٹوپی پہنے ہوئے ہیں، یہ بھی ان کی ہے۔''

ماموں یہ سن کر پھر بھڑک اُٹھے اور روٹھ کر جانے لگے۔ خاں صاحب کے خوشامد کرنے پر گرجے: ''بھلے آدمی! تم نے تو واقعی حد کردی احمق پن کی۔ میں کہتا ہوں کہ آخر اس کمبخت ٹوپی کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

خاں صاحب نے ماموں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بڑی مشکل سے راضی کیا۔

اسی دوران دولھا کے والد مبارک باد وصول کرتے ہوئے اِدھر آ نکلے۔ ان کو دیکھتے ہی خاں صاحب نے پھر ماموں کا تعارف کرایا: ''عقیل صاحب! ان سے ملیے۔ یہ ہیں ہمارے ماموں حشمت علی خاں۔ سادات نگر سے اس بار ایم۔ این۔ اے کے لیے الیکشن لڑ رہے ہیں۔ بہت ہر دل عزیز ہیں، کام یابی یقینی ہے۔ اور ہاں، ان کے سر پر جو یہ ٹوپی رکھی ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں کروں گا۔''

اب ماموں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے ٹوپی اتار کر خاں صاحب کے پیروں میں پٹخی اور وہیں سے سیدھے اپنے گھر سادات نگر روانہ ہو گئے اور خاں صاحب سے ہمیشہ کے لیے تعلقات ختم کر لیے۔ ☆

بھینسا اور میں

جاوید اقبال

مجھے درخت پر بیٹھے شام ہوگئی تھی، مگر یہ بلا کسی طرح بھی ٹلتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جنگلی بھینسا مسلسل درخت کے چکر کاٹ رہا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ بھینسا تھک کر یہاں سے چلا جائے تو میں نیچے اُتروں اور اس منحوس جنگل سے نکلوں۔ اُدھر بھینسا اس انتظار میں تھا کہ میں نیچے اُتروں تو وہ اپنے نوکیلے سینگوں اور کُھروں سے میرا بُھرتا بنادے۔

میرا پیشہ چڑیا گھروں کو جانور مہیا کرنا ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے خرگوشوں

کے ایک نایاب جوڑے کے بارے میں اطلاع دی، جنھیں اس نے اس جنگل میں دیکھا تھا۔ کافی دنوں سے میرے ہاتھ کوئی بڑا شکار نہیں لگا تھا اور میری جیب بالکل خالی ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو خرگوش پکڑ کر میں کچھ رقم کما لوں۔

چناں چہ میں آج صبح ان خرگوشوں کی سُن گُن لینے جنگل میں آیا تھا۔ اپنا کھانے پینے کا سامان اور خرگوش پکڑنے کے پھندے وغیرہ میں نے ایک بڑے درخت کی کھوہ میں چھپا دیے تھے اور خود خرگوش کی کھوج میں نکل پڑا، مگر ایک تنگ سی پگڈنڈی پہ میرا سامنا خرگوش کے بجائے اس جنگلی بھینسے سے ہو گیا۔ یہ اس طرح اچانک میرے سامنے آیا کہ میرے لیے چھپنا ممکن نہ رہا۔ اگر میں بھاگ کو فوراً ایک قریبی درخت پر نہ چڑھ جاتا تو یہ بھینسا یقیناً مجھے گرا کر اپنے کُھروں سے کچل دیتا۔

مجھے درخت پر چڑھتے دیکھ کر اس نے اتنے زور سے درخت کو ٹکر ماری کہ اس زوردار جھٹکے سے درخت کی شاخ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور میں نیچے گرتے گرتے بچا۔ اب سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا، مگر یہ بھینسا یہاں سے ہلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میرا کھانے کا جو تھوڑا بہت سامان تھا، میری پہنچ سے دور درخت کی کھوہ میں رکھا تھا۔ جیب میں چند بسکٹ اور چاکلیٹ تھی، جو میں وقفے وقفے سے کھا کر اپنی بھوک کو بہلاتا رہا۔ بھینسے کے لیے بھوک کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ نرم نرم گھاس سے اپنا پیٹ بھر لیتا، مگر بڑے چوکنے انداز میں کھاتے ہوئے بھی اس کی ایک نظر اوپر میری طرف ہی رہتی۔

شام کا اندھیرا پھیلا تو مجھے اُمید بندھی کہ شاید اب یہ بَلا ٹل جائے، مگر اس وقت میری اُمیدوں پہ اوس پڑ گئی جب بھینسا وہیں درخت کے نیچے پاؤں پسار کر لیٹ گیا۔ ساری رات درخت پہ بیٹھے بیٹھے میرے بازو، ٹانگیں اور کمر اکڑ گئی۔ مچھروں نے کاٹ

کاٹ کر بُرا حال کر دیا۔ ایک بار میں نے اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر درخت سے اُتر کر بھاگنے کا ارادہ کیا، مگر پتوں کی ذرا سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی تو بھینسا چوکنا ہو گیا، اس لیے میں نے درخت پر بیٹھے رہنے ہی میں عافیت جانی۔

صبح کا اُجالا ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ پیاس سے حلق خشک ہو گیا تھا۔ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ پھر ہلکی ہلکی دھوپ نکلی تو مجھے اونگھ آ گئی اور میں درخت کی شاخوں سے لپٹ کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا بھینسا نیچے موجود نہیں تھا۔ مارے خوشی کے میرے منھ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ ارد گرد بھینسے کا کوئی نشان نہ پا کر میں جلدی سے نیچے اُترا اور جنگل سے باہر جانے والے راستے کی طرف دوڑ لگا دی۔

میں جلد سے جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتا تھا۔ بھاگتے ہوئے میں پیچھے مُڑ کر بھی دیکھ رہا تھا کہ کہیں بھینسا پیچھے تو نہیں آ رہا ہے۔ اسی گھبراہٹ میں، میں ایک گہرے گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔ یہ گڑھا میرے جیسے ہی کسی شکاری نے کسی جانور کو پھانسنے کے لیے کھود رکھا تھا۔ گڑھا اوپر سے بڑی مہارت سے جھاڑ جھنکار سے ڈھکا ہوا تھا۔ جیسے ہی میرا پاؤں گڑھے میں پڑا، میں نے قریب ہی اُگی ہوئی ایک مضبوط جھاڑی کو پکڑ لیا اور میں گڑھے میں گرنے سے بچ گیا۔ ابھی میں اس حادثے سے سنبھلا ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کے بھاگنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پلٹ کر دیکھا تو بھینسا گرد و غبار کا طوفان اُڑاتا اس طرف آتا نظر آیا۔ مکار بھینسا یقیناً کہیں چھپ گیا تھا، مجھے درخت سے اُترتے دیکھ کر اس نے خاموشی سے میرا پیچھا کیا اور اب موقع دیکھ کر مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔

جیسے ہی بھینسا بھاگتا ہوا میرے قریب پہنچا اور ایک زوردار ٹکر مار کر مجھے گرانا چاہا، میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ بھینسا اپنی ہی جھونک میں آگے نکل گیا اور پھر زوردار

آواز سے گڑھے میں جا گرا۔ اس کے گرنے سے جو دھما کا ہوا، اس سے آس پاس کی زمین ہل گئی۔ گڑھے سے مٹی کا ایک طوفان سا اُٹھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس درخت کی طرف چل پڑا، جہاں میری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ بھینسے سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی، کیوں کہ کوئی بھی چڑیا گھر بھینسے کا خریدار نہیں تھا۔ میرا کام بس اتنا تھا کہ گڑھا کھودنے والے شکاری کو بھینسے کے گڑھے میں گرنے کی خبر دے دوں، تاکہ وہ اور اس کے ساتھی آ کر اس خونخوار بھینسے کو سبق سکھائیں کہ کسی کو بلا وجہ تنگ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ☆

امی جان، نعمت بیگم

سعدیہ راشد

مجھے معلوم نہیں کہ میری ماں کا نام ''نعمت'' کس نے رکھا تھا۔ یوں تو ظاہر ہے کہ ان کے والد یا والدہ نے رکھا ہوگا۔ لیکن امی جان کی پُر اخلاق زندگی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نام نعمت رکھتے وقت ان کے ذہن اور دل میں یہ جذبہ رہا ہوگا کہ ان کی بیٹی ان کی تمناؤں کے مطابق لوگوں کے لیے نعمت ثابت ہو، اور میں پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میری امی جان اپنے شوہر اور اپنی اولاد کے لیے اور جن لوگوں سے بھی ان کا واسطہ رہا، ان کے لیے نعمت ہی تھیں۔ انسان کا واسطہ زندگی میں جن لوگوں سے پڑتا ہے، وہ ان کے لیے راحت کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں اور زحمت کا باعث بھی۔ میری امی جان میرے لیے تو واقعی نعمت تھیں، اور میرے ابا جان کے لیے بھی راحت، سکون اور کام یابی کی ساتھی تھیں۔ میرے والدِ گرامی شہید حکیم محمد سعید ایک غیر معمولی انسان تھے۔ انسانوں کے سچے دوست، معاون، خیر خواہ اور رہنما۔ ان کو انسانوں کی زندگی کو پُر سکون اور سہل بنا کر اور علم و اخلاق کی روشنی سے منور کر کے خوشی ہوتی۔ ابا جان نوعمری ہی سے باعمل، مستعد اور فعّال تھے، لیکن ان کی صلاحیتیں اور توانائیاں اپنی ذات تک محدود

نہیں تھیں اور ان توانائیوں کو وہ دوسروں پر صرف کر کے سکون اور راحت محسوس کرتے تھے۔ ان ساری باتوں میں ان کو امی جان کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اس اعتبار سے میری امی جان ان کے لیے نعمت ثابت ہوئیں۔

امی جان میرے لیے ہر لحاظ سے ہر پہلو سے نعمت تھیں۔ مجھے زندگی گزارنے اور اچھی زندگی گزارنے کا جو کچھ سلیقہ بھی آیا ہے، اس کی وجہ بچپن میں امی جان کی تربیت ہے۔ وہ مہمانوں کی خدمت کو ضروری سمجھتی تھیں۔ ہمارا گھرانہ درمیانہ کہا جا سکتا ہے، یعنی جو طرزِ زندگی میرے والدین نے اپنایا، اسے اپنے مزاج کے لحاظ سے درمیانہ کہنا چاہیے۔ مثلاً ہمیں ریڈیو سننے کی اجازت پابندیوں کے ساتھ تھی۔ آواز اتنی اونچی نہ ہو کہ گھر کے دوسرے لوگوں کے کاموں میں خلل نہ پڑے۔ مہمانوں کے لیے جو کچھ تیار کیا جا رہا ہے، اس میں ہم بچوں کے لیے بھی کام کا کچھ حصہ تھا، مثلاً قیمہ پیسنا، مسالا ملا کر ٹکیاں بنانا وغیرہ۔

اتوار کے دن ہم خالہ زاد، پھوپھی زاد بہنیں مل بیٹھتی تھیں اور خوب باتیں کرتیں۔ کوئی نئی کتاب پڑھی ہے تو وہ کیسی لگی۔

ہمارے بچپن کے زمانے میں معاشرت میں میز کرسی کا حصہ زیادہ نہیں تھا۔ چبوترے پر دری اور چاندنی بچھائی جاتی تھی۔ ہماری امی جان، ہر مہمان کو رشتے دار سمجھ کر اس سے محبت اور عزت کا سکوت کرتی تھیں۔

ہمیں بچپن میں اپنے کپڑے خود دھونے، یونی فارم خود دھونے، اپنے جوتوں پر خود پالش کرنے کی عادت ڈالی گئی۔ ہمیں چھٹی کے دن اپنے کمرے کی خود صفائی کرنی پڑتی تھی۔ امی جان کی سوچ یہ تھی کہ بچپن کی سختی، بعد میں آسانیاں پیدا کرے گی۔ ☆

پھول

مسعود احمد برکاتی

پھول کتنے اچھے لگتے ہیں، کتنے حسین، کتنے خوش بُو دار، رنگ برنگے، چھوٹے بڑے، نازک نازک۔

فطرت کی بہار، قدرت کا عطیہ، انسان کی آرزو۔ پھول بالکل ننھے منے بچوں کی طرح ہیں۔ بچوں کی طرح پھول بھی ہماری زندگی ہیں۔ زندگی کو رنگ و بُو دینے والے ہیں۔ ذہن کو خوشی اور دل کو اُمید اور اُمنگ بخشنے والے ہیں۔

کتنے کم عقل ہیں وہ لوگ، جو پھولوں کی قدر نہیں کرتے۔ کتنے نادان ہیں وہ لوگ، جو پھولوں کی بہار سے لطف نہیں اُٹھاتے۔ کتنے ظالم ہیں وہ لوگ، جو پھولوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ دیکھو، سامنے باغیچہ ہے۔ کیسا ہرا بھرا، کتنا شاداب، کیسا رنگین و حسین۔ سبز سبز پودے، نازک نازک پھول۔ اُودے، نیلے پیلے، ہرے لال۔ یہ رنگ کہاں سے آئے۔ یہ پھولوں ہی کی دین تو ہیں۔ انھی سے تو ہمیں اوکسیجن ملتی ہے۔ اوکسیجن کی کمی ہمیں نڈھال کر دیتی ہے۔ ان کی حفاظت گویا حُسن و رنگینی کی حفاظت ہے۔ ان کی قدر زندگی کی قدر ہے۔

ان کو نہ توڑو، ان کو نہ مَسلو، ان کو زندہ رہنے دو، یہ تمھیں صحت مند زندگی دیں گے۔ یہ تمھاری آنکھوں کو تازگی دیں گے۔ تمھارے دماغ کو فرحت دیں گے۔ یہ تمھارے دل کو نزاکت دیں گے۔ ان کی لطافت تمھاری زندگی کو حُسن اور توانائی سے بھر دے گی۔

اپنی زندگی میں لطافت، نزاکت، رعنائی، رنگ، مہک، حُسن اور خوش بُو کو باقی رکھنا ہے تو پھولوں کی زندگی کا سامان کرو۔ ☆

علم خزانہ

مسعود احمد برکاتی

دولت خرچ کرنے سے گھٹتی ہے۔ کیا کوئی ایسی دولت بھی ہے، جو خرچ کرنے سے بڑھتی ہے! ہاں، دنیا میں ایک دولت ایسی بھی ہے جس کو خرچ کرو تو وہ بڑھتی ہے۔ جتنا زیادہ خرچ کرو گے، اتنی ہی بڑھے گی، اتنی ہی پھیلے گی۔ اس دولت کا نام ہے علم۔

علم کے خزانے میں سے جتنا خرچ کرو گے، یہ خزانہ اتنا ہی بڑھے گا۔ خرچ کرنے کا مطلب ہے کوئی چیز دوسروں کو دینا، چاہے وہ بدلے میں دی جائے یا مفت دی جائے۔ جب ہم کوئی چیز دوسروں کو دے دیتے ہیں تو وہ ہمارے پاس نہیں رہتی، لیکن علم ہی ایک ایسی چیز ہے جو کسی کو دے دینے کے بعد بھی ہمارے ہی پاس رہتی ہے، بلکہ وہ ہمارے پاس اور زیادہ محفوظ ہو جاتی ہے۔

علم ایک ایسا خزانہ ہے جس کو محفوظ کرنے کے لیے کسی تالے یا کنجی کی ضرورت نہیں۔ اس خزانے کی کنجی تم کسی کو بھی دے سکتے ہو، جو چاہے اس میں سے جتنی دولت لے لے، تمھارا خزانہ محفوظ رہے گا۔ یہ خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ ہاں، اگر اسے خرچ نہ کرو گے تو یہ خالی ہو جائے گا۔ جو لوگ اپنے علم کے خزانے کو قفل لگا کر رکھتے ہیں، ان کو نہیں معلوم کہ وہ اپنا خزانہ خالی کر رہے ہیں۔ علم کے خزانے کو بند کر دو تو اس میں دیمک لگنے لگتی ہے اور وہ تمھارے کام کا بھی نہیں رہتا۔

جو شخص دوسروں کو سکھاتا ہے، وہ خود بھی سیکھتا ہے۔ تم کسی کو ایک لفظ سکھاؤ گے تو دو لفظ خود بھی سیکھو گے۔ اگر تم اپنے علم کو چھپاؤ گے تو تم سے بھی چھپ جائے گا، بلکہ

چھن جائے گا۔

علم گھٹتا ہے یا بڑھتا ہے۔ ایک حالت پر کبھی قائم نہیں رہتا۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ تم نے جو کچھ سیکھ لیا، وہ ہمیشہ کے لیے تمھارا ہو گیا۔ علم کہتا ہے کہ مجھ سے کام لو۔ اگر کام نہ لو گے تو میں روٹھ جاؤں گا۔ دوست سے دوستی قائم رکھنے کے لیے تمھیں اس سے ملتے جلتے رہنا چاہیے۔ اگر کسی دوست سے ملنا جلنا بند کر دو تو دوستی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ ملتے جلتے رہو تو دوستی میں گرمی باقی رہتی ہے، تازگی آتی رہتی ہے اور دوست ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔ علم بھی تمھارا دوست ہے۔ اس سے ملتے رہو گے تو اس میں تازگی اور توانائی آتی رہے گی۔ ملنا چھوڑ دو گے تو تم اس کو بھول جاؤ گے اور یہ تمھیں بھول جائے گا۔

علم ایک ایسا دوست ہے، جو اپنے ذکر سے خوش ہوتا ہے۔ اس کا جتنا زیادہ ذکر کرو گے، اتنا ہی خوش ہو کر تمھارے قریب آئے گا۔ تمھیں جتنا علم بھی آتا ہے، اس کو دوسروں تک پہنچاؤ، دوسروں تک پہنچانے کے لیے تم اس کا ذکر کرو گے۔ جو کچھ تمھیں آتا ہے، اس کو دُہراؤ گے، زبانی دُہراؤ یا لکھ کر دُہراؤ، کسی طرح بھی دُہراؤ۔ اس کی یاد تازہ ہو گی اور وہ تمھارے دماغ سے محو نہ ہو گا، تمھارے دل سے نہ نکلے گا۔

علم سے تعلق برقرار رکھو تو اس سے محبت بڑھتی ہے۔ وہ بھی تم سے مانوس ہو جاتا ہے اور تمھیں نئی نئی چیزیں لا کر دیتا ہے۔ تمھارے لیے آسان سے آسان تر ہوتا جاتا ہے۔ تمھیں اس کی صحبت میں مزہ آنے لگتا ہے اور نئی نئی باتیں تمھیں بتانے لگتا ہے۔ علم تمھاری عزت میں اضافہ کرتا ہے۔ شرط یہی ہے کہ علم سے تعلق نہ توڑو۔ اس سے کبھی

منھ نہ موڑ و۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھو۔ علم بادشاہ ہے، اس لیے وہ کسی دوسرے کی بادشاہی قبول نہیں کرتا۔ اگر تمھیں اس تک پہنچنا ہے تو عام راستے سے ہی جانا پڑے گا۔ کوئی خاص راستہ تمھیں علم تک نہیں لے جائے گا۔ علم تک پہنچنے کے لیے کوئی شاہی راستہ نہیں ہے۔ ہاں، عام راستے پر چل کر جو محنت اور لگن کا راستہ ہے، جب تم علم تک پہنچ جاؤ گے تو پھر تم خود شاہوں سے بے نیاز ہو جاؤ گے۔

علم شاہوں اور شہزادوں کو دوست نہیں رکھتا، لیکن اپنے دوستوں کو شاہ اور شازادہ بنا دیتا ہے۔ ☆

ریڈار کسے کہتے ہیں؟

ریڈار (RADAR) کا لفظ انگریزی کے چار الفاظ ریڈیو ڈیٹیکشن اینڈ رینجنگ کا مخفف ہے اور اب یہ ہماری زبانوں پر اس طرح چڑھ گیا ہے کہ ہم ان لفظوں کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے، جن سے یہ بنا ہے۔ سائنس دانوں نے ۱۹۲۲ء میں اسے بنانے کی کوشش شروع کر دی تھی، لیکن اس کو شہرت اٹھارہ سال بعد، دوسری جنگ عظیم میں ملی۔ جنگ کے بعد امن کے زمانے میں بھی یہ آلہ بہت کار آمد ثابت ہوا ہے۔ اس نے بحری جہازوں کے سفر اور ہوائی جہازوں کی پرواز کو بہت محفوظ بنا دیا ہے۔

ریڈار کی مدد سے ہم رات کی تاریکی یا کہر کی دھند میں بھی بہت دور حرکت کرنے والی چیزوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ آلہ ریڈیو کی لہریں چاروں طرف بھیجتا ہے اور جب یہ لہریں کسی حرکت کرنے والی چیز سے ٹکراتی ہیں تو واپس مڑ کر آتی ہیں، جنھیں یہ آلہ پکڑ لیتا ہے۔ یہ لہریں آس پاس کے دیہات، آسمان اور سمندر کا ایک نقشہ بنا دیتی ہیں، جس سے حرکت کرتی ہوئی چیزوں مثلاً بحری جہاز یا ہوائی جہاز کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔

مرسلہ : مہک اکرم، لیاقت آباد

چاہت کی سرزمیں

حکیم خاں حکیم

کیا خوب ہے یہ دھرتی ، کیا خوب آسماں ہے
اس پاک سر زمیں کا ہر ذرّہ کہکشاں ہے
اس کا ہر ایک باسی عظمت کا راز داں ہے

پھولوں کا ہے یہ مسکن ، چاہت کی سرزمیں ہے
اس جیسا خوب صورت کوئی وطن نہیں ہے

امن و سکوں کا پیکر اس کا ہر اک نگر ہے
سب لوگ شادماں ہیں ، مطمئن ہر بشر ہے
علم و ہنر کی ضَو سے روشن ہر ایک گھر ہے

پھولوں کا ہے یہ مسکن ، چاہت کی سرزمیں ہے
اس جیسا خوب صورت کوئی وطن نہیں ہے

لطف و کرم ہے رب کا ، موسم ہر اک حسیں ہے
ہر دن ہے اس کا پیارا ، ہر رات دلنشیں ہے
چہرے کِھلے کِھلے ہیں ، روشن ہر اک جبیں ہے

پھولوں کا ہے یہ مسکن ، چاہت کی سرزمیں ہے
اس جیسا خوب صورت کوئی وطن نہیں ہے

فاختہ - امن کی پیامبر

فضیلہ ذکاء بھٹی

فاختہ دنیا بھر میں امن کی پیامبر ہے۔ اس پرندے کو دنیا بھر میں امن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے بھی جو کہ عالمی ادارۂ انصاف ہے، امن کی نشانی کے طور پر فاختہ ہی کا انتخاب کیا ہے۔

فاختہ کا تعلق کبوتروں کے خاندان سے ہے۔ ویسے بھی فاختہ اور کبوتر کا فرق کرنا مشکل ہے۔ اسے آپ چھوٹا کبوتر کہہ سکتے ہیں۔ فاختہ عام طور پر سفید یا گہرے رنگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی چونچ لمبی اور پتلی ہوتی ہے، جب کہ دُم لمبی۔

بنیادی طور پر فاختہ کی دو اقسام ہیں:

(۱) بیج کھانے والی فاختہ (۲) پھل کھانے والی فاختہ۔

بیج کھانے والی فاختہ زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس کی خوراک میں نرم شاخیں، سبزیاں اور کچھ پتیاں و کیڑے مکوڑے شامل ہیں۔ اس قسم کی فاختائیں عموماً کسی گھر کی کھوہ یا پھر روشن دان میں رہتی ہیں۔ پھل کھانے والی فاختائیں اپنے رہنے کے لیے اونچے گھروں میں گھونسلے بنانا پسند کرتی ہیں۔ اس قسم کی فاختہ چوں کہ پھل کھاتی ہے اور پھل ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوتا، اس لیے اس کی صحت عموماً خراب رہتی ہے۔

فاختہ انٹارکٹیکا اور آئس لینڈ کے علاوہ دنیا بھر میں تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ یہ زیادہ تر براعظم آسٹریلیا اور ایشیا میں ملتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق فاختہ کی

تقریباً ساڑھے چار سو کے قریب اقسام ہیں۔ جس طرح کوا کائیں کائیں اور چڑیاں چوں چوں کی آوازیں نکالتی ہیں، اسی طرح فاختہ گوگو کی آوازیں نکالتی ہے۔

فاختہ انسانوں سے بہت جلد مانوس ہو جاتی ہیں۔ یہ آپ کی اُنگلی یا ہاتھ پر بیٹھ جاتی ہیں۔ چوں کہ یہ زیادہ قیمتی پرندہ نہیں ہے، اس لیے اکثر لوگ اسے گھروں میں پالتے ہیں۔ فاختہ بہت نفیس پرندہ ہے اور یہ صاف ستھرا رہنا پسند کرتا ہے۔ فاختہ ایک وقت میں دو انڈے دیتی ہے۔ انڈے سینے کا کام نر اور مادہ دونوں کرتے ہیں۔ انڈوں سے بچے ۱۴ سے ۱۶ دنوں میں نکل آتے ہیں۔ انڈے سے نکلنے والے بچے کو اس کے والدین اپنی چونچ بچے کی چونچ میں دے کر پھونکیں مارتے ہیں۔

تقریباً ایک ماہ میں فاختہ کے بچے اُڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایشیائی فاختہ کا رنگ عموماً سفید ہوتا ہے۔ آسٹریلوی فاختہ کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ سب سے خوب صورت فاختہ کو ''ڈائمنڈ فاختہ'' کہا جاتا ہے۔ اس کے چلنے کا انداز بہت نرالا ہوتا ہے۔ یہ پُھدک پُھدک کر چلتی ہے۔

فاختاؤں کی دوسری اقسام میں اسٹاک زیبرا، ٹرٹل اور پہاڑی فاختہ ہیں۔ فاختہ کی ایک قسم کو زخمی فاختہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے سینے پر سرخ رنگ کا نشان ہوتا ہے، جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے اسے ابھی ابھی گولی لگی ہو۔

جدید تحقیق کے مطابق فاختہ سورج سے نکلنے والی بالا بنفشی شعاعیں (الٹرا وائلٹ شعائیں) محسوس کر سکتی ہے، جب کہ انسان ان شعاعوں کو محسوس نہیں کر سکتا۔ فاختہ کی سُننے کی صلاحیت دوسرے پرندوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ میلوں دور سے

آنے والی مدھم آوازیں بھی سن سکتی ہے۔

اس کے برعکس فاختہ کی دیکھنے کے صلاحیت اتنی اچھی نہیں ہوتی۔ فاختہ ایک غیر معمولی پرندہ ہے۔ عموماً پرندے پانی پینے کے لیے چونچ میں پانی بھر کر گردن اوپر اُٹھاتے ہیں۔ فاختہ واحد پرندہ ہے جو کہ گردن اُٹھائے بغیر پانی پیتا ہے، کیوں کہ اس کا حلق ممالیہ جانوروں سے ملتا جلتا ہے۔ فاختہ ایک چھوٹا پرندہ ہے، مگر دنیا بھر کو امن کا پیغام دیتا ہے۔ ☆

ریاضی کا کھیل

ایک سے نو تک کوئی بھی عدد لیں اور اسے ۳ سے ضرب دیں۔ جو عدد آئے اس میں ۳ جمع کر دیں اور اسے پھر ۳ سے ضرب دیں جو اعداد حاصل ہوں، انھیں آپس میں جمع کرلیں ہر صورت میں جواب ۹ ہی آئے گا۔

مثلاً ۴ کا عدد لیا۔ اسے ۳ سے ضرب دیا تو ۱۲ جواب آیا۔

اب اس میں ۳ جمع کر دیں تو عدد ۱۵ حاصل ہوا، پھر اسے ۳ سے ضرب دیں تو ۴۵ آیا۔

اب ۴۵ کو آپس میں جمع کریں ۴ + ۵ = ۹

مرسلہ : تحریم خان، نارتھ کراچی

سبق آموز مثال

شہید حکیم محمد سعید

نونہالو! لندن میں میری ایک باجی آپا رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ بیٹا اپاہج ہے اور گزشتہ ۳۲ سال سے لندن کے ایک اسپتال میں داخل ہے۔ اُس اسپتال میں بلا معاوضہ اس بچے کا علاج جاری ہے۔ کیا مجال اسپتال کی توجہ میں فرق آ جائے۔ ۳۲ سال سے یہ اسپتال ایک مریض کی خدمت میں مصروف ہے۔ سارا خرچ حکومت ادا کر رہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بچہ شفایاب نہیں ہوگا، مگر جب تک وہ سانس لے رہا ہے، حکومت اس کی ذمے دار ہے اور اس کی ماں بچے کی محبت میں لندن نہیں چھوڑ سکتی۔ تنہا وہاں بیٹھی ہے۔ سارا خاندان سرگودھا اور راولپنڈی میں ہے۔

نونہالو! یہ ہوتی ہے فلاحی مملکت! حکومت برطانیہ فلاحی مملکت ہے، جس کا یہ ایک نمونہ میں نے تم کو دکھایا ہے، مگر ابھی بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ نونہالو! باجی آپا کا گھر خستہ ہو گیا۔ اُس کی مرمت نہیں ہوئی ہے۔ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ باجی آپا نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ لندن میں رہتی ہیں۔ حکومت برطانیہ کی شہری ہیں۔ ان کے حالات خراب ہیں۔ بچہ اسپتال میں ہے۔ ان کا گھر درست کیا جائے، تا کہ وہ جب تک سانس ہے، یہاں رہ سکیں۔

نونہالو! حکومت برطانیہ کے افسروں نے آ کر مکان کا معائنہ کیا۔ رپورٹ تیار کی اور اعلا افسروں کو دے دی۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا، مکان واقعی خستہ ہے، اسے درستی چاہیے اور اس پر تقریباً چالیس ہزار پاؤنڈ اسٹرلنگ صرف ہوں گے۔ رپورٹ میں یہ مشورہ دیا گیا کہ مکان کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک میں مالکہ مکان خود رہیں اور تین
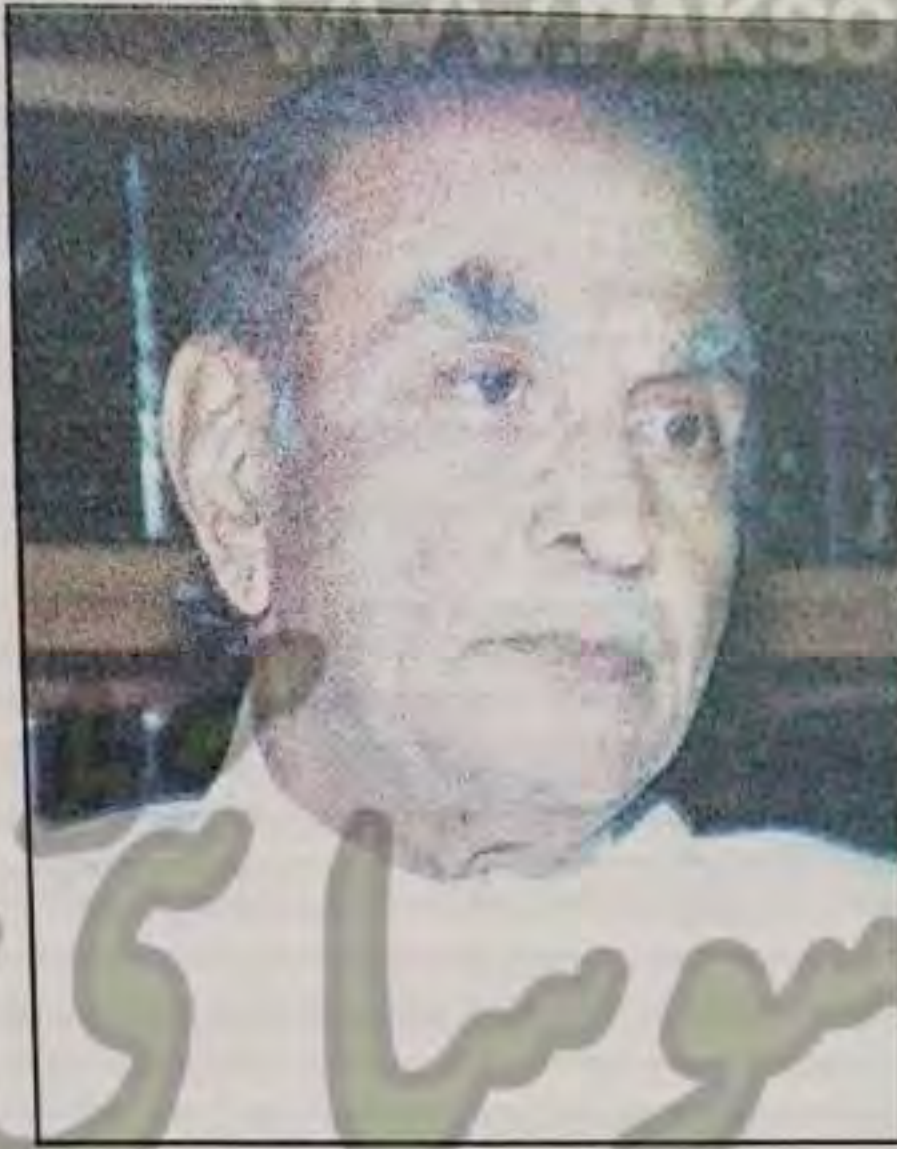
جسے کرائے پر دے دیں، تاکہ ان کو مالی مسائل درپیش نہ ہوں۔

نونہالو! حکومت برطانیہ نے اپنے انتظام سے چالیس ہزار پاؤنڈ خرچ کر کے محترمہ باجی آپا کا مکان درست کرا دیا۔ اب وہ نہایت اطمینان سے رہ رہی ہیں۔ ان کو کرایہ بھی مکان سے مل رہا ہے۔ محترمہ باجی آپا اب اس کرائے میں سے رقم بچا کر اسپتال کو دے دیتی ہیں، جہاں ان کا بچہ ہے۔ اس اسپتال میں ایک عطیہ فنڈ بھی ہے۔ محترمہ باجی آپا اب اس فنڈ میں رقم جمع کرا دیتی ہیں۔ یہ ان کی دیانت داری ہے۔

نونہالو! یہ فلاحی مملکت ہے، ایسی ہوتی ہے فلاحی مملکت۔ باجی آپا پاکستانی ہیں۔ انگریز نہیں ہیں۔ ہاں، حکومت برطانیہ کی شہری ہیں۔ حکومتِ برطانیہ نے گورا کالا نہیں دیکھا۔ انسان کی تکلیف رفع کر رہی ہے۔

نونہالو! ایک بات اور بھی ہے۔ یہ بھی بتائے دیتا ہوں۔ محترمہ باجی آپا کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہے۔ ان کے پاس حکومت برطانیہ کا سرٹی فکیٹ ہے۔ وہ اس کو دکھا کر لندن کی ہر زمین دوز ٹرین اور لندن کی ہر بس میں بلا ٹکٹ سفر کر سکتی ہیں۔ ہر ساٹھ سالہ برطانوی شہری کو یہ رعایت حاصل ہے۔ تم نے دیکھا کہ فلاحی مملکت کیا ہوتی ہے! ☆

زیور

مسعود احمد برکاتی

کریم بخش کو آج نوکری سے جواب دے دیا گیا۔ آج وہ پھر سے بے روزگار ہو گیا اور آج پھر اس کے سامنے چند سال پہلے کی طرح فاقوں کا خوف تھا۔ وہ پریشانی میں سوچتا ہوا سیدھا گھر جانے کے بجائے گوٹھ کے باہر نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا گھر پہنچا۔

آج سے چار سال پہلے وہ گوٹھ کے اس اسکول میں اپنے دوست چنا کی مہربانی سے پٹے دار (چپراسی) لگا تھا۔ یہ اس کی پہلی نوکری تھی۔ اس نے عمر بھر نوکری نہیں کی۔ وہ جوتے بناتا تھا۔ اس کو جوتے بنانے کی مشق تھی۔ خود شہر جاتا اور منڈی سے چمڑا خرید کر لاتا۔ چمڑے کو صاف کرتا، رنگتا، کاٹتا، سیتا اور کسی فرمے یا سانچے کے بغیر صرف اپنی

انگلیوں کی مدد سے کھردرے چمڑے کو خوب صورت جوتے کی شکل بخش دیتا۔

سالہا سال سے یہ اس کا معمول تھا۔ وہ اس میں مگن تھا۔ صبح سے شام تک وہ اس کام میں محو رہتا اور جب جوتے کا کوئی نیا جوڑا تیار ہوتا تو اس کو عجیب سی خوشی ہوتی۔ اس کی بیوی بھی جوتے بنانے میں تھوڑی بہت مدد کرتی۔ کھانے پکانے اور گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر رات کو وہ بھی جوتوں پر ستارے ٹانکتی، اوزاروں کو سِل پر گھس گھس کر تیز کرتی اور رکھ دیتی۔ وہ یہ کام چراغ کی روشنی میں کرتی۔ کچھ دن سے خبر اُڑی ہوئی تھی کہ گوٹھ میں بجلی آنے والی ہے، لیکن کریم بخش کی بیوی مہتاب کو اس خبر سے کوئی خاص دل چسپی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ گوٹھ میں بجلی آ جائے، تب بھی اس کے گھر میں تو دِیا ہی جلے گا۔ اس چراغ سے مہتاب کو محبت بھی بہت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں کا دیا ہوا یہ چراغ ہمیشہ رہے۔

کریم بخش کے دو لڑکے رحیم بخش اور الٰہی بخش تھے اور ایک لڑکی تھی، جس کا نام ولیہ تھا۔ دونوں لڑکے مسجد میں پڑھنے جاتے تھے۔ کریم بخش کے کچھ عزیز شہر جا کر بس گئے تھے۔ انھوں نے کئی بار زور دیا تھا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ بچوں کو اَن پڑھ رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ شہر میں قدم قدم پر تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے کریم بخش نے لڑکوں کو مسجد میں بٹھا دیا تھا، لیکن لڑکی کو گھر سے نکالنا اس کے نزدیک بزرگوں کی روح کو تکلیف پہنچانے کے برابر تھا۔ لڑکوں کو پڑھانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب شہر قریب آتا جا رہا تھا۔ اس کے بچپن میں تو حیدرآباد کا شہر اس کے گوٹھ سے بہت دور تھا، مگر اب تو شہر بڑھتے بڑھتے سامنے آ گیا۔ کریم بخش دل میں سوچنے لگا کہ اس بڑھاپے میں بھی میں

دو گھنٹے میں شہر پہنچ جاتا ہوں، اس لیے شہر کے لوگ بھی گوٹھ زیادہ آنے لگے ہیں اور ان کو دیکھ کر گوٹھ کے لڑکے بھی اپنا رنگ بدل رہے ہیں۔

زندگی کی گاڑی یونہی کھنچتی رہی، شہر والوں کی دیکھا دیکھی اب گوٹھ والے بھی لالچی ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں کے کسان بھی گھی میں ملاوٹ کرنا سیکھ گئے۔ سیر کا دو سیر گھی بنانے لگے تھے۔ جب سے ملاوٹی، بلکہ بناوٹی گھی ملنے لگا تھا، کریم بخش کم زور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ ہونے لگا تھا اور سر میں بھی درد رہنے لگا تھا۔ ایک دن تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ رعشہ بڑھ گیا تھا اور وہ باریک کام کرنے سے معذور ہو گیا۔ اب وہ جوتے نہیں بنا سکتا۔ اس کے دل پر بہت اثر ہوا، پھر بھی وہ عادت کے مطابق حکیم صاحب کے پاس نہیں گیا، حال آنکہ کئی لوگوں نے کہا کہ حکیم صاحب رعشہ کا

بڑا اچھا علاج کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اسکول میں چپراسی کی نوکری پر مجبور ہوا تھا۔ نوکری کے بعد کریم بخش کی زندگی بدل گئی تھی۔ صبح اُٹھ کر ناشتا کرتا اور اسکول چلا جاتا۔ اسکول میں کوئی خاص کام نہ تھا۔ ہر گھنٹے بعد گھنٹی بجا دینا اور کوئی کاغذ ہو تو اس کو اسکول کے چار پانچ کمروں میں گھوم کر ماسٹروں کو دکھا دینا۔ ماسٹر بھی اونگھتے رہتے۔ گوٹھ کا یہ پہلا اسکول تھا۔ ابھی بہت کم گوٹھ والے اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے پر راضی ہوئے تھے۔ کریم بخش کو اس نوکری میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بہت آرام کی نوکری تھی، لیکن ہیڈ ماسٹر کے گھر کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی بیوی جس کو کریم بخش بیگم کہتا تھا، سودا منگواتی اور اس کے کام میں اکثر کیڑے نکالتی۔ کبھی کہتی: ''سودا مہنگا لے آئے۔'' کبھی کہتی: ''بیسن میں کیڑے پڑے ہیں، دکھائی نہیں دیتا، جو خراب چیز اُٹھا لائے ہو۔''

کریم بخش کو ایسی باتیں سن کر بہت افسوس ہوتا۔ وہ چاہتا کہ بیگم کو جواب دے اور صفائی پیش کرے، لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ ہو جاتا۔ اس کے دوست نے بتا دیا تھا کہ نوکری میں باتیں سننی پڑتی ہیں۔ قصور نہ ہو جب بھی ڈانٹ کھانی پڑتی ہے۔ بہر حال وہ خون کے گھونٹ پی کر چپ چاپ گھر چلا جاتا۔

اس کو ہیڈ ماسٹر کا بھی خیال تھا۔ وہ اس کو اچھا سمجھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے کبھی اس کو سخت سست نہیں کہا تھا۔ کریم بخش کے دونوں لڑکوں کو بھی اسی اسکول میں داخلہ دے دیا تھا اور فیس بھی معاف کر دی تھی۔ کریم بخش دوسروں کے مقابلے میں حالات کی تبدیلی کی آہٹ زیادہ صاف سن رہا تھا، اس لیے اس نے بچوں کو مسجد کے مدرسے سے اُٹھا کر

اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ مدرسے میں انھوں نے قرآن پاک کا سبق اور سندھی زبان تو سیکھ لی تھی، لیکن اردو اور حساب کے لیے اسکول بھیجنا ضروری تھا۔

کریم بخش گھر آ کر چپ لیٹ جاتا۔ وہ اپنے حالات، بیگم کے سلوک اور گوٹھ کے واقعات کے بارے میں گھنٹوں سوچتا رہتا۔ کبھی کبھی مہتاب پوچھتی تو وہ ہیڈ ماسٹر کی بیگم کی باتیں بتا دیتا۔ مہتاب، بیگم کو خوب گالیاں دیتی اور اس کے ساتھ ہیڈ ماسٹر کو بھی بُرا بھلا کہتی، لیکن کریم بخش چاہتا کہ وہ کسی کو بُرا نہ کہے۔ خاص طور پر ہیڈ ماسٹر کی بُرائی تو وہ سننا بھی نہیں چاہتا۔ وہ کہتا: ''اس لیے تو میں نے کہا تھا کہ ولیہ کو بھی اسکول بھیج دے۔ تعلیم کے بغیر وہ بھی بیگم کی طرح ہی ہو جائے گی۔'' مہتاب بڑبڑاتی رہی اور وہ حقہ گڑگڑاتا رہا۔

شام کو کریم بخش ''صاحب'' کے گھر گیا، سودا لا کر دیا اور بیگم معمول کے مطابق باتیں سنانے لگیں۔ اتفاق سے صاحب بھی اس وقت باہر سے گھر میں داخل ہوئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی اپنی بیوی کی باتیں نہیں سنی تھیں اور نہ کریم بخش نے کبھی اس کی شکایت کی تھی۔ آج اتفاق سے انھوں نے خود اپنے کانوں سے سنی اور آنکھوں سے دیکھا تو پہلے تو بیوی کو ڈانٹا کہ ایک تو وہ تمھارا کام کرتا ہے اور اوپر سے تم اس کو ڈانٹتی ہو۔ بیگم نے اس کے جواب میں وہ لن ترانی ہانکی اور ایسے ایسے فرضی قصے سنائے کہ وہ بیگم کے بجائے کریم بخش کو ڈانٹنے لگے۔ انھوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ اُن کا خیال غلط نکلا۔ وہ کریم بخش کو بہت وفادار اور ایمان دار سمجھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایسے ناقابل اعتبار آدمی کو اسکول میں نہیں رکھ سکتا۔ تم کل آ کر اپنا حساب کر لینا۔

کریم بخش نے بیوی کو بتایا کہ آج نوکری سے جواب مل گیا ہے تو مہتاب کو فکر تو بہت ہوئی، لیکن اس نے میاں کی پریشانی کے خیال سے اپنی پریشانی ظاہر نہیں کی، بلکہ اس کی ہمت بندھائی۔ کریم بخش بھی ہمت والا آدمی تھا۔ دوسرے ہی روز سے خوانچہ لگانے لگا اور اس طرح دال روٹی چلنے لگی۔

ایک دن دوپہر کو رحیم بخش اور الٰہی بخش اسکول سے واپس آئے تو انھوں نے بتایا کہ اسکول سے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پانچ ہزار روپے چوری ہو گئے۔ پھر کریم بخش کے پوچھنے پر رحیم بخش نے ساری تفصیل سنائی کہ آج صبح ہیڈ ماسٹر صاحب کو شہر جا کر بڑے دفتر میں یہ رقم جمع کرانی تھی۔ الماری کھولی تو لفافہ جس میں یہ رقم رکھی تھی، نہیں ملا۔ گھبرا کر جلدی جلدی سارے کاغذات اُلٹ پلٹ کر ڈالے، لفافہ ملنا تھا نہ ملا۔ سب حیران پریشان تھے۔ کیا قصہ ہوا، کون لے گیا، چور نے الماری کیسے کھولی اور کس وقت کھولی؟ غرض طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے اور ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق رائے دے رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کو سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ آج بڑے دفتر میں رقم ضرور جمع ہو جانی چاہیے، ورنہ ان کو نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ رحیم یہ سب بیان کرتا رہا اور کریم بخش بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ ہیڈ ماسٹر کی پریشانی سے اس کو بھی فکر ہو گئی۔ بے چارے کی بیوی بھی پھوہڑ ہے، اتنی بڑی رقم کہاں سے لائے گا۔ یکا یک وہ اُٹھا، کوٹھری میں گیا، ولیہ کے لیے جو زیور بنا کر رکھا تھا، وہ تھیلی میں لپیٹ کر سیدھا بازار گیا اور زیور بیچ کر اسکول پہنچا۔ اسکول میں قیامت برپا تھی۔ ہیڈ ماسٹر کا منھ اُترا ہوا تھا۔ وہ گردن جھکائے بیٹھے سوچ میں گم تھے۔ کریم بخش نے سامنے پہنچ کر سلام کیا تو انھوں نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔

سلام کا جواب دیا۔ بے بسی اور شرمندگی سے پھر گردن جھکا لی۔ گھبراہٹ میں ان سے کچھ سوچا نہیں جا رہا تھا۔ کریم بخش آگے بڑھا، اپنی تھیلی کھولی اور پانچ ہزار روپے ہیڈ ماسٹر کے آگے رکھ دیے اور آہستہ آہستہ کہنے لگا: ''صاحب! رحیم بخش سے مجھے سارا قصہ معلوم ہوگیا ہے۔ آپ دیر نہ کریں، دفتر بند ہونے سے پہلے پہنچ کر سرکاری امانت داخل کردیں۔ میں بیٹی کا زیور بیچ کر یہ روپے لایا ہوں۔ جب بھی آپ کے پاس ہوں، مجھے دے دیجیے گا۔ زیور زینت کے لیے ہوتا ہے، لیکن عزت کے لیے بھی ہوتا ہے۔ عزت سے بڑھ کر زیور نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر ہیڈ ماسٹر کا جواب سننے سے پہلے کریم بخش کمرے سے باہر آ گیا۔ ☆

سازش

پروفیسر مشتاق اعظمی، بھارت

ماموں جان کو میں نے اپنی کہانی پڑھ کر سنائی تو انھوں نے کہا: ''کہانی دل چسپ ہے۔تم نے مشہور ادیب منشی پریم چند کا انداز اپنانے کی کوشش کی ہے۔''

ماموں جان کے اس تبصرے کو میرے ماموں زاد بھائی شہزاد نے بھی سنا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر پیدا ہوئی، جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کے ذہن میں کسی نئی شرارت نے جنم لے لیا ہے۔ دوسرے دن یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا، جب شہزاد نے مجھے بھائی جان کے بجائے منشی پریم چند کہنا شروع کر دیا۔

اور ایک دن تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ میری غیر موجودگی میں ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ شہزاد سے انھوں نے میرے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا: ''آپ کے پوچھ رہے ہیں، منشی پریم چند کو؟ وہ موجود نہیں ہیں۔ آپ شام کو تشریف لائیں۔''

اور شام کے وقت جب وہ تشریف لائے تو ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے:

''بھئی، مبارک باد! تم بڑی آسانی سے پریم چند بن گئے۔ بس دو چار کہانیاں لکھ کر۔''

حال آنکہ مجھے معلوم ہے کہ پریم چند کو بھی پریم چند بننے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑا تھا۔

میں نے شہزاد کو بار بار سمجھایا۔ اَن گنت بار خوشامد کی اور کئی دفعہ ڈانٹا ڈپٹا بھی کہ وہ مجھے ستانے سے باز آئے، مگر پھول کی پتی سے کہیں ہیرے کا جگر کٹا ہے!

ایک روز جب میں رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعے کا لطف اُٹھا رہا تھا تو شہزاد کی بے وقت آمد نے میری محویت کو توڑ دیا۔ میں کچھ پریشان سا

ہو گیا، کیوں کہ یہ میرے اچھے بھلے مزاج کو خراب کرنے والا تھا۔ وہ خلافِ معمول کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا: ''بھائی جان! اگر میں آپ کو تنگ کرنا چھوڑ دوں تو......''

مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا اور میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا: ''یعنی......یعنی تم مجھے ستانے سے باز آ جاؤ گے؟''

''جی ہاں۔'' اس کے لہجے میں یقین تھا۔

میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور میں نے کہا: ''یہ بڑی اچھی بات ہو گی شہزاد!''

''لیکن ایک شرط ہے بھائی جان!'' شہزاد بولا۔

''بس بتا بھی دو، کیا شرط ہے؟'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''آپ کو میرے نام سے ایک اچھی سی کہانی لکھ کر کسی رسالے میں چھپوانی ہو گی۔'' اس نے شرط پیش کی۔

''بس اتنی سی بات! کہو تو ابھی لکھ دوں، تمھارے لیے ایک دل چسپ سی کہانی؟'' میں نے کہا۔

''اب اس قدر جلدی بھی نہیں ہے۔ جب آپ کو اطمینان ہو جائے تو لکھ دیجیے گا۔'' شہزاد بولا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا سنو!'' میں نے اسے روکا۔

''تم نے رسالہ جگنو دیکھا ہے نا!''

''جی ہاں! بہت ہی خوب صورت رسالہ ہے۔'' شہزاد نے جواب دیا۔

''غالباً دو تین مہینے بعد اس کا خاص نمبر شائع ہوگا۔ اس کے لیے مجھے ضرور کچھ لکھنا ہوگا۔ اس وقت میں تمھاری طرف سے بھی ایک مزے دار کہانی ایڈیٹر صاحب کو بھیج دوں گا۔''

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ممنون نظروں سے دیکھا۔ اس کے بعد شہزاد چلا گیا۔ تین مہینے نہایت چین اور سکون کے ساتھ گزرے۔

اسے میری تقدیر کا چکر ہی کہنا چاہیے کہ جس وقت ''جگنو'' کے خاص نمبر میں شریک ہونے کا دعوت نامہ میرے نام آیا، میں امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ بڑی ہی عجیب صورتِ حال تھی۔ ایک طرف شہزاد کی بار بار یاد دہانی بلائے جان تھی اور دوسری جانب خاص نمبر میں شریک ہونے کی میری شدید خواہش کا دم نکل رہا تھا۔ میری مصروفیت نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ پھر بھی میں نے وقت نکال کر ایک کہانی لکھی۔ شہزاد سے میں نے کہا کہ امتحان کے بعد اس کے لیے کہانی لکھ دوں گا، لیکن اس کی ضدی طبیعت میری تسلی سے کب بہلتی۔ وہ مجھ سے ناراض اور بدگمان ہوگیا۔ میں نے کہانی کا مسودہ تیار کیا۔ لفافے میں رکھا اور اب بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اسے بند کر کے سپردِ ڈاک کر دوں کہ اتنے میں شہزاد خلافِ اُمید کمرے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ وہ بڑے باغیانہ انداز میں بولا: ''آپ میرے لیے کہانی نہیں لکھتے تو نہ لکھیں، اب میں خود کہانی لکھوں گا۔ منشی پریم چند جی!''

اس خیال سے کہ تنبیہ کے لیے یہ مناسب موقع ہے۔ میں تیزی سے اُٹھا اور ایک بھرپور تھپٹر اس کے گال پر جڑ دیا اور کہا: ''خبردار! جو آیندہ مجھے پریم چند کہا۔''

شہزاد گال سہلاتے ہوئے اتنے زور سے بلبلایا کہ اس کی آواز امی جان کے کانوں

تک پہنچ گئی اور اس کے بعد وہی ہوا، جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے، یعنی باورچی خانے میں میری پکار ہوئی اور مجھے وہاں اپنی سنائے بغیر امی کی نصیحت آمیز تقریر سننی پڑی۔

''چھوٹوں پر شفقت کرنی چاہیے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔'' سن کر منھ لٹکائے چلا آیا۔ لفافہ بند کر کے میں نے اسی وقت ڈاک کے حوالے کر دیا۔

جب کہانی پوسٹ کیے ہوئے قریب قریب دو مہینے اور امتحان ختم ہوئے ایک ماہ کچھ دن گزر چکے تھے۔ آج صبح سے میں ایک دوست کے یہاں مدعو تھا۔ شام کے وقت گھر آ کر اپنی ڈاک دیکھی۔ اس میں ''جگنو'' کا خاص نمبر بھی موجود تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی کی ورق گردانی کی، مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ اس میں میری کہانی موجود نہیں تھی اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی چیز یہ تھی کہ شہزاد کی کہانی شاملِ اشاعت تھی۔ مجھے کوفت ہوئی کہ میری کہانی کا آخر کیا حشر ہوا؟ مجھے اس کی رسید بھی تو نہیں ملی تھی۔ کیا ڈاک میں گم ہو گئی؟ پھر میری نگاہ شہزاد کی کہانی کے عنوان پر پڑی۔

''سازش......!'' میری کہانی کا عنوان بھی تو یہی تھا۔ مجھے خیال آیا۔ اس کے بعد میں نے کہانی کی ابتدائی سطریں پڑھیں اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا، میری حیرت اور تشویش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس لیے کہ یہ کہانی تو لفظ بہ لفظ وہی تھی جو ''جگنو'' کے خاص نمبر کے لیے میں نے بھیجی تھی۔ پھر کہانی پر شہزاد کا نام کیسے آ گیا؟ میں اس گتھی کو سلجھا نہ سکا۔ انتہائی اُلجھن کے عالم میں بے دلی کے ساتھ میں دوسرے خطوط الٹ پلٹ کرنے لگا۔ ایک گہرے سرخ رنگ کا لفافہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں نے خط کھول کر پڑھا:

"بھائی جان! عرف منشی پریم چند جی! یہ بات آپ کے لیے تشویش ہی کی نہیں، بلکہ پُراسرار بھی ہوگی کہ رسالہ "جگنو" کے خاص نمبر میں آپ کی کہانی کے ساتھ میرا نام کیسے آ گیا۔ آیئے، میں اس راز سے آپ کو آ گاہ کروں۔ آپ کو اس دن کا واقعہ بھولا نہیں ہوگا جب آپ "جگنو" کو بھیجنے کے لیے کہانی لفافے میں رکھ چکے تھے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ عین اسی وقت مجھے آپ کو ستانے کی سوجھی اور میں آپ کے کمرے میں یہ کہنے کے لیے گیا کہ خود "جگنو" کے لیے کہانی لکھوں گا۔ اس وقت میرے منشی پریم چند جی کہہ دینے پر آپ کو شدید غصہ آیا تھا اور آپ نے مجھے ایک زوردار تھپڑ سے نوازا بھی تھا۔ میرا شور سن کر امی نے آپ کو باورچی خانے میں طلب کیا تھا۔ باورچی خانے جانے اور وہاں سے آنے میں جو وقت آپ کو لگا، بس اسی میں، میں نے اپنا کام بنا لیا، یعنی نہایت پھرتی کے ساتھ آپ کی کہانی لفافے سے نکالی۔ کہانی کے خاتمے پر آپ کا نام درج تھا۔ میں نے اسے قلم زد کر کے اپنا نام لکھ دیا۔ ایڈیٹر کے نام جو آپ کا خط تھا، اسے نکال لیا اور پھر کہانی لفافے میں رکھ دی۔ اس طرح آپ کی "سازش" شہزاد کی سازش کا شکار ہوگئی اور یہ سب محض اس لیے ہوا کہ آپ نے میرے ساتھ وعدہ خلافی کی تھی۔

اب اگر آپ یقین کریں تو میں آیندہ آپ کو نہ ستانے کا عہد کرتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ بھی اس کا موقع نہ آنے دیں۔

آپ کا بھائی: شہزاد

غصے کی شدت سے میں نے رقعہ کو مٹھی میں بھینچ لیا اور سوچنے لگا کہ شہزاد کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ کیا..... کیا میں اس سے سمجھوتہ کرلوں؟ کہیں وہ مجھے پھر تو نہیں ستائے گا.....؟ اس کی سازش نے مجھے گہری سوچ میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆

پانی

کرشن پرویز، بھارت

ایک نعمت ہے ہر آدمی کے لیے
تم بچاؤ اسے زندگی کے لیے

پیڑ پودے اُگیں ، پھول فصلیں کھلیں
لازمی ہے بہت ہر کسی کے لیے

اس سے بجلی بنے ، کارخانے چلیں
گھر میں کام آتی ہے یہ روشنی کے لیے

صاف برتن کہ کپڑے کہ خود کو کریں
تازہ پانی ہی لو تازگی کے لیے

یوں برباد کرتے رہے گر اسے
کل کو الزام دو گے کمی کے لیے

اس کو ضائع جو پرویزؔ کرتے رہے
کچھ نہ چھوڑو گے اگلی صدی کے لیے

منھ بولی بیٹی

حبیب اشرف صبوحی

گرمیوں کے دن تھے۔ مغل بادشاہ جہانگیر صبح سویرے شکار کی غرض سے اپنے محل سے نکلا۔ شاہی فوج کا چاق چوبند دستہ ہمراہ تھا۔ ''بندھیا چل'' کے جنگل میں داخل ہی ہوئے تھے کہ جہانگیر کی نظر ایک خوب صورت ہرن پر پڑی۔ جہانگیر نے گھوڑے کو ایڑی لگائی، لیکن ہرن چوکڑیاں بھرتا دور نکل گیا۔

جہانگیر مسلسل ہرن کے تعاقب میں تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اسے زخمی کیے بغیر پکڑ لے، لیکن یوں لگتا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی رکنے کا نام نہ لے گا۔ آخر ایک جگہ ہرن کو گھنی جھاڑیاں نظر آئیں۔ وہ اس طرف بھاگا اور ایک لمبی چھلانگ لگا کر جھاڑیوں میں گم ہوگیا۔ اب جہانگیر کو احساس ہوا کہ وہ ہرن کے تعاقب میں بہت دور نکل آیا ہے اور محافظ دستہ بھی کہیں پیچھے رہ گیا۔

جہانگیر پسینے میں شرابور تھا۔ اسے بڑی شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، لیکن دور دور تک آبادی کا کوئی نام ونشان نظر نہ آیا۔

سورج اپنی تپش سے ''بندھیا چل'' کے جنگل کو بُری طرح جھلسا رہا تھا۔ لُو نے پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پیاس کی شدت سے گھوڑے کا بھی بُرا حال تھا اور بادشاہ کی زبان پر تو پیاس کے مارے جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔

اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن دور دور تک پانی کا چشمہ نظر نہ آیا، نہ آبادی کا کوئی نشان۔ اسی عالم میں گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر اسے

بہت سے درخت نظر آئے۔ وہ بے تابی سے ان کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا کہ وہاں مکانات بھی بنے ہیں۔ لق و دق جنگل میں آبادی کا نشان دیکھ کر جہانگیر نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر دیکھا کہ ایک مکان کے باہر چبوترے پر چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ لڑکی کیا تھی، حسن کا ایک شاہکار تھی۔ جہانگیر گھوڑے سے اُترا اور لڑکی کے پاس گیا۔

لڑکی نے کھڑے ہو کر ادب کے ساتھ سلام کیا۔ پھر بولی: ''آپ مسافر معلوم ہوتے ہیں۔ پسینے سے آپ کا بُرا حال ہے۔ آپ یہاں آرام سے چبوترے پر بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔''

لڑکی مکان کے اندر چلی گئی۔ جہانگیر چبوترے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ ''بندھیا چل'' کے اس سنسان جنگل میں بھی کیا ایسا حسن جنم لے سکتا ہے، جسے دیکھ کر چاند بھی شرمائے؟ جہانگیر دست قدرت کی ان فیاضیوں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی واپس آ گئی۔

اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور دوسرے میں ایک تھال تھا، جس میں روٹی رکھی تھی۔ لڑکی نے یہ دونوں چیزیں جہانگیر کے آگے رکھتے ہوئے کہا: ''پہلے آپ روٹی کے چند لقمے تناول فرمایئے، کیوں کہ سخت گرمی میں ایک دم ٹھنڈا پانی پینے سے نظامِ ہضم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے، آپ بہت دور سے آئے ہیں۔''

بادشاہ کو بھوک اور پیاس دونوں ستا رہے تھے۔ تاہم ایک کم عمر لڑکی سے عقل مندی کی یہ بات سن کر اس نے پہلے روٹی کے چند نوالے لیے اور پانی پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اس دوران لڑکی پانی سے بھری ایک بڑی بالٹی گھوڑے کے آگے رکھ چکی تھی۔ جہانگیر کھانا کھا کر فارغ ہوا، تو لڑکی اس کے ہاتھ دُھلانے کے لیے لٹیا میں پانی لائی۔ ہاتھ دُھلاتے

ہوئے لڑکی کی نظر جہانگیر کی انگشتری پر پڑی، جس میں ایک نہایت قیمتی ہیرا جڑا ہوا تھا۔

ہاتھ دُھلانے کے بعد وہ مکان کے اندر گئی۔ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ڈھیر سارے کاغذ تھے۔ وہ پھر جہانگیر کے سامنے بیٹھ کر کچھ لکھنے لگی۔ جہانگیر اس کی بچکانہ حرکتیں دیکھ کو محظوظ ہو رہا تھا۔ اتنے میں لڑکی نے کہا: ''معزز مسافر! کیا میں آپ کا ہاتھ دیکھ سکتی ہوں؟''

جہانگیر نے اپنا دایاں ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ ہاتھ دیکھ کر لڑکی پھر مکان کے اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک اور کاغذ تھا۔ جہانگیر نے دیکھا، کاغذ پر اس کا زائچہ بنا ہوا تھا۔ لڑکی نے بلند لہجے میں آواز دی: ''ماتا جی، ماتا جی!''

چند لمحوں بعد اس کی ماں سامنے والے مکان سے باہر آئی اور پوچھا: ''روپ متی! کیا بات ہے؟'' پھر اس کی نظر جہانگیر پر پڑی تو پوچھا: ''روپ متی! یہ کون ہیں؟''

قبل اس کے لڑکی کچھ بتاتی، جہانگیر نے کہا: ''بہن! میں آگرہ کا رہنے والا اور شاہی فوج کا سپاہی ہوں۔ راستہ بھول کر اِدھر آ نکلا۔ روپ متی کا ممنون ہوں، اس نے میری خدمت کی اور میرے گھوڑے کو بھی پانی پلایا۔''

روپ متی بولی: ''جناب! گستاخی معاف، آپ اپنی شخصیت ہم سے چھپا رہے ہیں۔ میرے زائچے کے مطابق آپ ہمارے مہاراج جہانگیر ہیں۔''

بادشاہ لڑکی کی یہ قابلیت دیکھ کر بہت حیران ہوا، لیکن اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''بیٹی! تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تم سے اپنی شخصیت نہیں چھپا رہا، لیکن تم یہ بتاؤ، تم اس ویران جنگل میں کیوں کر رہتی ہو؟ تمھاری معاش کا کیا ذریعہ ہے؟''

''مہاراج......''

جہانگیر بات کاٹتے ہوئے بولا: ''میں نے کہا نا، کہ میں مہاراج نہیں۔''

تبھی بڑھیا بولی: ''روپ متی کے پتا بیجا پور کے بہت بڑے پنڈت اور شاہی نجومی تھے۔ ایک روز وزیراعظم کسی بات پر ان سے ناراض ہو گئے۔ اس پر روپ متی کے پتا شاہی ملازمت چھوڑ کر اس جنگل میں آ بسے۔ قریب کے ایک گاؤں والے ہماری کفالت کرتے ہیں۔ روپ متی کے پتا گزشتہ سال آنجہانی ہو چکے۔ انھوں نے بیٹی کو بھی نجوم اور رمل کی تعلیم دی تھی۔ بیٹی کا امتحان لینے کے لیے ایک روز انھوں نے اس جگہ کا زائچہ بنوایا۔ روپ متی کے بنائے زائچے کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کے اپنے بنائے اور روپ متی کے زائچے میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ ان زائچوں سے معلوم ہوا کہ ایک روز شہنشاہ ہمارے مہمان ہوں گے اور شناخت کا ذریعہ ان کی انگشتری بنے گی، جس میں نہایت درجہ قیمتی یاقوت جڑا ہوگا۔ مہاراج! روپ متی کا زائچہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہی مہاراج جہانگیر ہیں۔ پرماتما آپ کو سلامت رکھے۔''

بڑھیا کی بات سن کر جہانگیر کے لیے اپنی شخصیت کو چھپانا اب مشکل ہو گیا۔ بولا:

''خیر اس بات کو چھوڑیں کہ میں کون ہوں، لیکن روپ متی آج سے میری بیٹی ہے۔''

پھر اس نے اپنی انگشتری اُتار کر روپ متی کو دیتے ہوئے کہا: ''اسے تم یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھو۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شاہی فوج کا ایک دستہ وہاں آ پہنچا۔ شہنشاہ کو دیکھ کر انھوں نے فوجی انداز میں سلام کیا اور پھر جہانگیر کے اشارے پر نہایت ادب سے ایک طرف

کھڑے ہو گئے۔

روپ متی نے کہا: ''مہاراج! ان دو ثبوتوں کی موجودگی میں تو آپ میرے زائچے کو غلط نہیں کہہ سکتے۔''

''دو ثبوت؟'' جہانگیر نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں مہاراج! پہلا ثبوت تو یہ شاہی فوج کی سلامی ہے۔ دوسرا ثبوت انگوٹھی ہے، جو مہاراج جہانگیر کے سوا کوئی عطا نہیں کر سکتا۔''

پھر وہ تیزی سے مکان کے اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک خط لا کر جہانگیر کو دیا اور بتایا کہ یہ میرے پتا جی نے مرنے سے پہلے آپ کے نام لکھا تھا۔ جہانگیر نے خط کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا: ''مہاراج! بہت جلد آپ دکن پر بھی حکمرانی کریں گے۔ میری درخواست ہے کہ میری بیوی اور بچی کا بھی خیال رکھیں۔''

یہ خط پڑھ کر جہانگیر نے حکم دیا: ''روپ متی اور اس کی والدہ کو شاہی محل پہنچا دیا جائے۔''

شاہی محل میں ملکہ نور جہاں نے روپ متی اور اس کی والدہ کی کفالت اپنے ذمے لے لی۔ کچھ دنوں بعد آگرہ کے ایک معزز برہمن خاندان میں روپ متی کی شادی کر دی گئی۔ روپ متی کے والد کی حیثیت سے خود جہانگیر شادی کی تمام رسوم میں شریک ہوا اور جہیز کے طور پر ایک بہت بڑی جاگیر بھی اُسے عطا کی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ جہانگیر کے بعد جب شاہجہان تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی منھ بولی بہن کی جاگیر میں مزید اضافہ کر دیا۔

☆☆☆

بیت بازی

ایسی ہے بدمزاجی ، ہر لحظہ میرؔ تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے، جھگڑا ہے آسماں سے

شاعر: میر تقی میرؔ پسند: سائرہ الیاس، میر پور خاص

جتنے سخن ہیں، سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تن درست

شاعر: نظیر اکبر آبادی پسند: قیوم بلال، کوئٹہ

لوگ کہتے ہیں ، بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہے ، جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

شاعر: اکبر الہٰ آبادی پسند: امتیاز الدین، ملتان

کرے دشمنی کوئی تم سے اگر
جہاں تک بنے ، تم کرو در گزر

شاعر: مولانا اسماعیل میرٹھی پسند: وجیہ متین، نارتھ کراچی

ایک ہی فن ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے ، اسے خفا کیجیے

شاعر: جون ایلیا پسند: کومل فاطمہ اللہ بخش، لیاری

یہ دیس ہے اندھے لوگوں کا
اے چاند! یہاں نہ نکلا کر

شاعر: حبیب جالب پسند: زینب ناصر، فیصل آباد

اب ہارنے کے بعد یہی کام رہ گیا
زخموں کو دیکھنا ، کبھی تلوار دیکھنا

شاعر: نیر سوز پسند: سید احسن علی، کراچی

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور
رستے میں جو کھڑا تھا، وہ کہسار ہٹ گیا

شاعر: شکیب جلالی پسند: محمد منیر نواز، ناظم آباد

اتنی دہشت ہے کہ اپنے آپ سے ڈرنے لگے
لوگ گھر کی بات اب بازار میں کرنے لگے

شاعر: سلیم کوثر پسند: سید مازن علی ہاشمی، کورنگی

یہ کھیل بھول بھلیوں کا ہم نے کھیلا بھی
تری تلاش بھی کی اور خود کو ڈھونڈا بھی

شاعر: مظہر امام پسند: شائم عمران، کراچی

افضل مری منزل تو مجھے مل کے رہے گی
ٹھوکر جو لگی ہے تو بہت تیز چلا ہوں

شاعر: افضل منہاس پسند: مہک اکرم، لیاقت آباد

ایک عالم سے تو بچ نکلے ، مگر
بھاگ کر جاؤ گے اب خود سے کہاں

شاعر: عبدالمتین عارف پسند: ماہ نور طاہر، کراچی

لوٹ کر آئیں تو شاید رستے ہوں بدلے ہوئے
رہ شناسی کے لیے کوئی نشان رکھ لیجیے

شاعرہ: نازش سکندر پوری پسند: زینب سعید، لاہور

گراں گزرتی ہے جب زندگی کی یکسانی
تو گھر کی چیزیں اِدھر سے اُدھر بدلتے ہیں

شاعر: رحمت اللہ خان پسند: شائلہ ذیشان، ملیر

شکار

نسیمہ قاسمی برکاتی

ایک گیدڑ تھا، جس کا سارا بچپن ماں باپ کی بے جا محبت اور ناز برداری میں گزرا تھا۔ ماں باپ کی صرف یہی ایک اولاد تھی، اس لیے اس کو لاڈ ہی لاڈ میں رکھا، کمانے کا سلیقہ سکھایا، نہ کچھ پیٹ بھرنے کا ڈھنگ۔

میاں گیدڑ بھی اماں باوا کے لاڈ میں ایسے کھوئے رہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد خود بھی کبھی توجہ نہیں دی کہ دیکھیں ذرا، ماں باپ کیسے روزی کماتے اور پیٹ بھرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلیں تو کب...... جب کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور دنیا میں یہ اکیلے رہ گئے۔ اب بڑے پریشان ہوئے کہ کیا کیا جائے اور روزی کیسے پیدا کی جائے؟

چند دن تو آس پاس کے مُردار چیل، کوؤں پر جوں توں بسر کی، لیکن وہ بھی کہاں تک ساتھ دیتے۔ مجبور ہو کر آگے قدم بڑھایا، اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کہیں قریب ہی کوئی چیز کھانے پینے کو مل جائے تو دور کیوں جائیں، لیکن بغیر ہاتھ پیر ہلائے بھلا منھ میں نوالہ کون دیتا ہے؟ خیر، ذرا اور آگے چلے، دیکھا ایک شیر آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔ گیدڑ کا خون خشک ہو گیا، لیکن چھپ کر بھاگنا بھی نامناسب تھا۔ لاچار تیز تیز چل کر اور ادب سے جھک کر شیر کو سلام کیا اور دریافت کیا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟

شیر نے اپنی بادشاہت دکھاتے ہوئے اکڑ کر کہا: ''بھوک لگی ہے، جا رہا ہوں، ذرا شکار کی تلاش میں۔ اگر کھانا ہے تو چلو، تازہ مال ملے گا۔''

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ گیدڑ تیار ہو گیا۔ بہت دور چلنے کے بعد ایک جگہ شیر رکا اور گیدڑ سے بولا: ''جاؤ، سامنے جنگل میں تازہ مال دیکھ کر آؤ۔''

گیدڑ صاحب گئے اور بھاگتے ہوئے آ کر بولے: ''حضور! تھوڑی ہی دور ایک موٹی تازی گائے چارا چر رہی ہے۔''

شیر صاحب کے منھ میں پانی بھر آیا۔ گائے کے قریب جا کر ایک زوردار انگڑائی لی اور گیدڑ کو گھور کر بولے: ''دیکھ، میری آنکھیں لال ہوئیں؟''

گیدڑ، شیر کی طرف دیکھ کر جھٹ بولا: ''جی ہاں حضور! خوب ہو گئیں۔''

شیر نے بڑھ کر ایک دو ہتڑ بے چاری گائے کے سر پر مارا، جس سے اس کی کھوپڑی چیخ گئی۔ شیر نے پہلے تو نرخرہ پکڑ کر سارا خون چوس لیا، پھر بیٹھ کر اچھا اچھا گوشت خوب سیر ہو کر کھایا اور گیدڑ سے بولا: ''دیکھتے کیا ہو، آ جاؤ۔''

گیدڑ ہمت کر کے بولا: ''ہم کسی کا جھوٹا نہیں کھاتے۔ اب تو ہم خود شکار کریں گے اور کھائیں گے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ شکار اتنی آسانی سے مار لیا جاتا ہے۔ بلاوجہ ہم پریشان رہے اور باسی جانوروں پر ہی گزر کرتے رہے۔''

شیر ہنس کر بولا: ''اچھا دیکھ لیں گے تمھیں اور تمھارے شکار کو۔''

شیر کو وہیں چھوڑ کر میاں گیدڑ ایک طرف کو چل دیے۔ ابھی تھوڑی دور چلے تھے کہ سامنے سے ایک لومڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ گیدڑ میاں کھڑے ہو گئے۔ لومڑی نے گیدڑ سے پوچھا: ''ماما! کہاں جا رہے ہو؟''

گیدڑ صاحب پوری شان گیدڑی کے ساتھ بولے: ''کیا کریں بھئی، جھوٹن کھانے کی اپنی عادت نہیں۔ ہمیشہ تازہ شکار کھایا۔ باسی تو کتے، کوے کھاتے ہیں اور تم جانتی ہو مجھے تو کبھی خود شکار کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اِدھر بھوک لگی، اُدھر قسم قسم کا تازہ گوشت سامنے آ گیا۔ اب سر پہ پڑی ہے تو نکلے ہیں گھر سے۔ کہیں کوئی اچھا اور تازہ مال ملے تو ہاتھ ماریں۔ تم بھی چلی چلو۔ کھلا دیں گے تم کو بھی، کیا یاد کرو گی کہ کس سخی گیدڑ سے پالا پڑا تھا۔

لومڑی نے سوچا، چلو، اپنا کیا بگڑتا ہے، تھوڑی دیر کی تفریح ہی سہی۔ اس شیخی خور کی شیخی کا تماشا تو دیکھیں کہ یہ شکار کس طرح مارتا ہے۔

لومڑی گیدڑ کو بے وقوف بناتے ہوئے بولی: ''چل ماما! اس سے بہتر کیا بات ہے!

میرا بھوک سے بُرا حال ہو رہا ہے۔ تازہ تازہ شکار کھلائے گا تو اللہ تیرا بھلا کرے گا۔''

تھوڑی دور چلنے کے بعد گیدڑ نے شیر کی نقل کر کے محبت سے لومڑی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں یہاں ٹھیرے جاتا ہوں، تم آگے بڑھ کر کوئی تازہ شکار تلاش کر کے اطلاع دو۔''

لومڑی حکم کی تعمیل کرنے چلی اور جلدی واپس آ کر بولی: ''ماما! جلدی چلو، قریب کے کھیت میں ایک بڑی موٹی کھال والی گھوڑی چر رہی ہے۔''

گیدڑ خاں مٹکتے ہوئے لومڑی کے ساتھ چلے۔ قریب پہنچ کر گیدڑ نے شیر کی طرح ایک زوردار انگڑائی لے کر سوال کیا: ''بی لومڑی! میری آنکھیں لال ہوئیں؟''

لومڑی دیر تک گیدڑ کی آنکھوں کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولی: ''نا بھئی ماما! ہم کیوں جھوٹ بولیں، ہمیں کہیں بھی تمھاری آنکھوں میں لالی نظر نہیں آ رہی ہے۔''

گیدڑ نے پھر ایک زوردار انگڑائی لی اور لومڑی کو آنکھیں دکھائیں۔ لومڑی نے پہلے سے زیادہ دیر تک گیدڑ کی آنکھوں کو گھورا اور وہی جواب دیا۔

اب تو گیدڑ کو لومڑی کے جواب پر غصہ ایسا آیا کہ لومڑی کو کچا ہی کھا جائے، لیکن ضبط کرتے ہوئے اس نے لومڑی کو سمجھایا: ''لومڑی! شکار سے پہلے ایسے ہی کیا اور کہا کرتے ہیں۔ اب کے میں تجھ سے سوال کروں تو کہہ دینا کہ ہاں، آنکھیں لال ہو گئیں۔ پھر دیکھنا، کیسا عمدہ عمدہ گوشت تجھے کھلاتا ہوں۔''

اب لومڑی کو کیا عذر تھا۔ انگڑائی لیتے ہی بغیر دیکھے اس نے گیدڑ کی آنکھوں کی

لالی کا اعلان کر دیا اور گیدڑ خاں نے شیر کی نقل میں لپک کر گھوڑی کے جو ہتڑ مارنا چاہا تو گیدڑ اس کی دُم سے ٹکرایا۔ گھوڑی نے جو پچھلے پاؤں سے جھٹک کر لات ماری تو گیدڑ خاں وہیں چت ہو گئے اور بے چارے بھوکے ہی دوسرے جہاں کو سدھار گئے۔

لومڑی نے دیکھتے ہوئے ہمدردی سے کہا: ”ماما! جب تو ہوئی تھیں یا نہیں ہوئی تھیں، لیکن اب ہو گئیں تیری آنکھیں لال۔“

لومڑی نے بہت افسوس کیا کہ ماما! اگر تُو بچپن میں ہی اپنے طور پر شکار کرنے کا طریقہ سیکھ لیتا تو آج شیر کے شکار کی نقل کر کے اپنی جان نہیں گنواتا۔ اپنی چال چھوڑ کر بے سوچے سمجھے جو بھی دوسرے کی چال چلے گا، ضرور ٹھوکر کھائے گا۔

☆☆☆

مونا کا گاؤں

منظر عارفی

شہر سے کئی میل دور عبداللہ گوٹھ انتہائی غریب آبادی والا گاؤں تھا۔ اس کی کل آبادی صرف انیس خاندانوں پر مشتمل تھی۔ گاؤں کے لوگوں کے علاج معالجے کے لیے کوئی سہولت نہیں تھی۔ جو لوگ بیمار ہو جاتے، ان کا علاج ٹوٹکوں سے ہی کیا جاتا۔ جس کی زندگی ہوتی، وہ صحت یاب ہو جاتا، ورنہ اللہ کو پیارا ہو جاتا۔

گاؤں میں نہ گیس تھی، نہ پانی، نہ بجلی۔ ایک جانب بہت اونچے پہاڑ کے پیچھے میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا، اسی چشمے سے گاؤں کے لوگ پانی کی ضرورت پوری کرتے۔ کسی کو ایک لوٹا پانی بھی چاہیے ہوتا تو وہ اس اونچے پہاڑ پر چڑھ کر دوسری طرف اُتر کر پانی لاتا۔

اسی گاؤں میں ایک گیارہ سالہ بچی مونا اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ جب وہ

صرف دو سال کی تھی تو اس کا باپ اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں بڑی ہمت اور جانفشانی سے اپنی پیاری اور اکلوتی بیٹی کی پرورش میں لگ گئی۔

گاؤں میں پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا کہ مونا کی ماں اُسے بھی تعلیم دلواتی۔ نہ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ گاؤں سے بہت دور شہر کے اسکول میں بھیجتی۔

دو تین سال پہلے ایک بوڑھا ماسٹر نہ جانے کہاں سے گاؤں میں آ گیا تھا۔ اس کا نام تو معلوم نہیں کیا تھا، لیکن گاؤں والے اسے بابا ماسٹر کہنے لگے تھے اور اس نے بھی اس نام کو بخوشی قبول کر لیا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا اور گاؤں کے بچوں کو پڑھانا چاہتا تھا، لیکن گاؤں کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کو پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مونا کی ماں پارو بھی یہی سمجھتی تھی۔ اس کے باوجود یہ چاہتی تھی کہ مونا کچھ نہ کچھ تعلیم ضرور حاصل کر لے۔ ایک دن اس نے ہمت کر کے فیصلہ کیا کہ مونا کی پڑھائی کے لیے بابا ماسٹر سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ مونا کا ہاتھ پکڑ کر اس کے پاس جا پہنچی۔ بابا ماسٹر نرم طبیعت کا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتا۔ کسی سے خواہ مخواہ میل جول نہ رکھتا۔ پارو نے اس سے کہا: ''میں چاہتی ہوں کہ تم میری بیٹی کو لکھنا پڑھنا سکھا دو۔''

''میں سکھا دوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

پارو مطمئن ہو گئی اور دوسرے دن سے مونا کو اپنے ساتھ لے کر اس کے پاس آنے لگی۔ ماسٹر نے اپنے سامان میں سے اردو کی ایک کتاب، کاغذ اور پنسل نکالی اور مونا کو حرفوں کی پہچان بتانے لگا۔

دو سال کے عرصے میں مونا نے اردو لکھنا پڑھنا، انگریزی حروف کی پہچان، انسانی جسم کے حصوں، پھولوں، پھلوں اور جانوروں کے نام، روزمرہ استعمال میں آنے والی چیزوں کے نام انگریزی اور اردو میں یاد کر لیے۔ ماسٹر نے اسے مختلف محکموں کے

بارے میں بتایا کہ بجلی کا محکمہ کیا کرتا ہے۔ ڈاک کے محکمے کا کام کیا ہے۔ پولیس اور فوج کیا ہوتی ہے اور ان کے ذمے کیا کیا کام ہیں۔ اخبارات اور رسائل کیا ہوتے ہیں۔ صدر کیا ہوتا ہے۔ وزیرِ اعظم کس کو کہتے ہیں۔ غرض دنیا جہاں کی معلومات وہ مونا کو دیتا رہا۔ اردو اور انگریزی کے الفاظ لکھنا بھی اسے سکھا دیے۔

پہلے پہل تو گاؤں کے لوگوں نے مونا کی ماں کی اس کوشش کا مذاق اُڑایا، لیکن مونا کی ماں کی مستقل مزاجی دیکھ کر خاموش ہوگئے۔ مونا کی ماں ہمیشہ مونا کے ساتھ رہتی تھی۔ اپنے کان اور آنکھیں بھی کھلی رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے بہت سی معلومات اس کی یادداشت میں بھی محفوظ ہوگئی۔ اس کے بدلے وہ بابا ماسٹر کی خدمت بھی کر دیتی تھی۔ اس نے ایک وقت کا کھانا بابا ماسٹر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب مونا کی عمر چودہ سال ہوگئی تھی۔

ایک دن مونا کو نہ جانے کیا سوجھی، اس نے پانی میں نیل گھول کر گاؤں کے سردار

کے گھر کی دیوار پر اس کا نام لکھ دیا۔ نیچے گاؤں کا نام بھی لکھ دیا۔ پھر آس پاس اسی نیل سے خوب صورت بیل بوٹے بھی بنا دیے۔ جب وہ یہ کر رہی تھی تو گاؤں کا سردار اور دوسرے کئی لوگ مونا کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ مسکراتے ہوئے سردار کی طرف دیکھنے لگی۔ سردار ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مونا نے یہ کیا کیا ہے، کیوں کہ سردار سمیت وہاں کوئی بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ پھول اور بیل بوٹے البتہ اس کی سمجھ میں آ رہے تھے۔

مونا نے سردار کی حیرت دور کرتے ہوئے اس کو بتایا: ''سردار! یہ میں نے تمھارا نام لکھا ہے، سردار تاج زر اور یہ گاؤں کا نام لکھا ہے عبداللہ گوٹھ۔ کیسا لگ رہا ہے؟''

سردار خوشی سے نہال ہو گیا۔ وہ کبھی مونا کے ہاتھوں کو چومتا، کبھی ماتھا چومتا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے گاؤں کی ایک بیٹی اتنا پڑھ لکھ جائے گی کہ میرا نام اور گاؤں کا نام لکھنے لگے گی۔ گوٹھ والو! سن لو...... میں تم سب کا سردار ہوں، لیکن مونا کا تابعدار ہوں۔ میں نے پہلی بار اپنے نام کو کہیں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ آج سے مونا میری بیٹی ہے، بلکہ مجھے اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''

اس دن گاؤں کے کئی افراد اپنے بچے بابا ماسٹر کے پاس لے کر آئے اور اس سے کہنے لگے: ''ہمارے بچوں کو بھی پڑھا دو۔''

لیکن اس نے سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا کہ بھاگ جاؤ، پہلے پڑھنے نہیں آتے تھے، اب مونا کی عزت دیکھ کر للچا رہے ہو۔ بھاگ جاؤ۔

ایک دن مونا کو کہیں سے اخبار کا ایک صفحہ مل گیا۔ وہ اسے پڑھنے لگی۔ پھر اس کی نظریں ایک مقام پر ٹھیر گئیں، جہاں موٹے حروف میں ''مراسلات'' لکھا تھا۔ ماسٹر نے اسے مراسلات کے بارے میں بتایا تھا کہ اپنے علاقے کے مسائل لکھ کر اگر اخبارات کو

بھیج دیے جائیں تو وہ اوپر بڑا بڑا ''مراسلات'' لکھ کر نیچے خود شائع کر دیتے ہیں اور پھر ان مسائل کے حل کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آتی ہے۔ آج اخبار میں لکھے ہوئے پانچ مختلف خطوط اس کے سامنے تھے۔ ان مراسلوں کو پڑھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ مراسلے کس طرح لکھے جاتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں اپنے گاؤں کے مسائل لکھ کر اخبار کو بھیج دوں، شاید یہاں کی قسمت بھی بدل جائے۔

ماسٹر نے بتایا تھا کہ مراسلے صدر، وزیرِ اعظم یا گورنر یا وزیرِ اعلا کے نام بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ اسے لکھنا آتا تھا۔ اس نے صدر اور وزیرِ اعظم کے نام تفصیل سے ایک مراسلہ لکھا، جس میں گاؤں کے ایک ایک مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا۔ ماسٹر سے پوچھ کر گاؤں کا پتا لکھا۔ پھر وہ لفافہ لے کر ماں کے ساتھ سردار کے پاس پہنچ گئی۔ وہ حقہ پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر اس کے ہاتھ چومے اور پوچھا: ''میری بیٹی! کس کام سے آئی ہے میرے پاس؟''

مونا نے کہا: ''سردار! آج تمھیں ایک بہت اہم کام کرنا ہے۔ یہ لفافہ لو۔ یہ میں نے شہر کے سب سے بڑے اخبار کے لیے لکھا ہے۔ اس میں اپنے گاؤں کے سارے مسائل لکھے ہیں۔ تم جلد از جلد کسی بھی طرح قریبی شہر میں جا کر ڈاک خانے سے ایس پر ٹکٹ لگا کر یہ لفافہ ڈاک خانے کے حوالے کر دینا۔''

سردار نے کہا: ''بیٹی! میں یہ اہم کام ضرور کروں گا۔''

وہ اسی شام شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

پندرہ دن بعد ایک جیپ میں سوار چار افراد عبداللہ گوٹھ میں داخل ہوئے۔ وہ مونا کے گھر کا پتا پوچھ رہے تھے۔ آن کی آن میں پورے گاؤں میں ان کی آمد کی خبر پھیل گئی۔ لوگوں نے انھیں مونا کے گھر تک پہنچایا۔ انھوں نے مونا کو بتایا کہ ہم اسی اخبار کے

صحافی ہیں، جس میں تم نے مراسلہ لکھا تھا۔ آج ہم یہاں کا تفصیلی دورہ کرنے آئے ہیں۔ انھوں نے مونا کو پھولوں کے گلدستے دیے۔ شہر سے لائی ہوئی بہت سی چیزیں بھی اسے دیں۔ انھوں نے مونا اور اس کی ماں کی تصویریں بنائیں۔ ایک تصویر سردار کی بھی بنائی۔ پورے گاؤں کا دورہ کیا اور مختلف مقامات کی درجنوں تصویریں کھینچیں۔ مختلف لوگوں سے گاؤں کے مسائل کے بارے میں گفتگو کی۔ مونا، اس کی ماں اور سردار ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ رات ہو چلی تھی، اگرچہ وہ واپس جانا چاہتے تھے، لیکن گاؤں والوں نے انھیں روک لیا اور ان کی مہمان نوازی کی۔ صبح جاتے جاتے وہ یہ خوش خبری دے کر گئے کہ وہ لوگ جلد عبداللہ گوٹھ کے حالات بدلتے ہوئے دیکھیں گے۔ یہاں تک سڑک بنا دی جائے گی۔ یہاں اسکول، شفا خانے اور مدرسے کھولے جائیں گے۔ گیس، بجلی، پانی گھروں میں پہنچایا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے سردار کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا: ”ہمارے ساتھ شہر چلو، چند دن گھومو پھرو، تاکہ جب رپورٹ تصویروں کے ساتھ چھپ جائے تو اس اخبار کی کاپیاں اپنے اور مونا کے لیے لے کر آ جانا۔“

سردار ان کے ساتھ چلا گیا۔ دس دن بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں اخبار کی درجنوں کاپیاں تھیں، جس میں مونا کی تصویریں خوب نمایاں انداز میں چھپی تھیں۔ اخبار میں عبداللہ گوٹھ پر فیچر چھپا ہوا تھا۔ مونا نے گاؤں والوں کو اخبار میں چھپے فیچر کی ایک ایک سطر پڑھ کر سنائی۔ پھر صرف دو مہینے گزرے تھے کہ عبداللہ گوٹھ کی ترقی کا کام شروع ہو گیا۔ اعلا افسران نے خود تشریف لا کر ترقی کے کاموں کا افتتاح کیا۔ مونا کو حکومت کی طرف سے حسنِ کارکردگی کی شیلڈ دی گئی۔ اس کی ماں کے لیے تاحیات وظیفہ مقرر کر کے ساتھ ساتھ مونا کو حکومتی نگرانی میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دی گئی۔

مونا کو اس پیش کش پر سب سے زیادہ خوشی ہوئی اور اس نے فوراً قبول کر لی۔

ایک سال کے اندر اندر عبداللہ گوٹھ میں مونا گورنمنٹ پرائمری اسکول اور گورنمنٹ ٹیکنیکل اسکول برائے طالبات قائم کر دیا گیا۔ بیس بستروں کا ایک اسپتال جس میں ایک ایمبولینس بھی ہر وقت سروس کے لیے تیار تھی، قائم کر دیا گیا۔ مونا کی خواہش پر اس کا نام بابا ماسٹر کے نام پر ''بابا ماسٹر گورنمنٹ اسپتال'' رکھا گیا۔ عبداللہ گوٹھ کی گلیاں اور سڑکیں پختہ ہو گئیں۔ ٹیوب ویل لگا کر میٹھے پانی کا مسئلہ حل کر دیا گیا۔ کاشت کاری کے لیے ٹریکٹر اور دیگر زرعی آلات مہیا کر دیے گئے۔

عبداللہ گوٹھ کو شہر سے ملانے والی سڑک جو تین میل تک پکی بنا دی گئی تھی، اسے سردار ''تاج زر'' کے نام سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ شہر تک جانے اور واپس آنے کے لیے بس سروس کا انتظام بھی کر دیا گیا۔

مونا کو قریبی شہر کے ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہ حکومت کے خرچ پر پڑھنے اور اسکول کے ہاسٹل میں رہنے لگی۔ مونا کی بدولت اب عبداللہ گوٹھ جیسے گم نام گاؤں کا شہر سے رابطہ ہو چکا تھا۔

☆

ہمدرد نونہال

جوہر عباد

ہمدرد نونہال ہے ہر نونہال کا
ساتھی ہے پُر خلوص یہ اہل و عیال کا
دل کش جسامت و کتابت و طباعت
رکھتا ہے یہ رسالوں میں درجۂ کمال کا
مسعود احمد انکل کی ہر ماہ پہلی بات
دل پہ اثر ہوتا ہے۔ اُن کے ہر خیال کا
عمدہ ہیں مضامین تو اعلا کہانیاں
ہے راز دراصل یہی اس کے جمال کا
پڑھ کر تمام سلسلے، نت نئے لطائف
رہتا نہیں ہے نام ذرا بھی ملال کا
دیتے ہیں مزہ معلومات افزا کے صفحے
لکھا ہے سامنے جواب ہر اک سوال کا
مہنگائی کے اس دور میں قیمت رعایتی
چھوڑا نہیں ساتھ اب بھی اعتدال کا
بچے پڑھیں، ابو پڑھیں، ابو کے ابو پڑھیں
جوڑے ہوئے رشتہ یہ ماضی سے حال کا
حضرت حکیم سعید کا صدقۂ جاریہ
دنیا کے لیے بن گیا عنواں مثال کا
الحمدللہ، ہے تریسٹھ سال سے جاری
گویا ہے کام یاب سفر سالہا سال کا
اس ٹیم کا ہر شخص مبارک باد کا اہل
محنت کا ہے نتیجہ اراکینِ فعال کا
جوہر ہر اک نعمت کے لیے ہر گھڑی، ہر پل
کرتی رہو بس شکر ربِ ذوالجلال کا

ننھا مجرم

حسن منظر

جواد نے ایک کہانی اپنی ماں سے پہلی بار سنی اور اُسے تعجب ہوا۔ اتنی اچھی کہانی کبھی انھوں نے پہلے کیوں نہیں سنائی تھی۔ ساتھ ہی اُسے زبردست خواہش ہوئی کہ وہ یہ کہانی موسیٰ کو بھی سنائے، جو اس کا دوست بھی تھا اور بڑی خالہ کا لڑکا بھی۔ مشکل یہ تھی کہ دونوں میں کوئی ایک سو میل کا فاصلہ تھا اور ان دنوں ٹیلے فون بھی عام نہیں تھے کہ ریسیور اُٹھا کر نمبر گھماتا اور اُدھر سے جس کی بھی آواز آتی، اسے سلام کر کے کہتا، ذرا موسیٰ کو بلا دیجیے، مجھے اُسے ایک کہانی سنانی ہے۔ جواد کو یقین تھا کہ یہ کہانی موسیٰ نے بھی نہیں سنی ہوگی اور خود اس پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ آخر میں وہ رو پڑا تھا۔

کہانی یوں تھی: ایک فاختہ تھی اور اس کا ایک بچہ تھا۔ دونوں جہاں رہتے تھے، وہاں میوے کے درخت ہی درخت تھے، جن پر موسم میں میوے کے پھل دن بھر ٹپکتے رہتے تھے اور ان کے پھلوں اور پھولوں کی خوش بو سے جنگل مہکتا تھا۔ وہاں فاختائیں بھی ہر سُو اس طرف زمین پر بیٹھی نظر آتی تھیں کہ لگتا تھا فاختاؤں کا کھیت ہے۔

مگر میوہ سال بھر تو لگتا نہیں ہے، اس لیے جب موسم تھا، فاختہ نے ایک دن جتنا ہو سکتا تھا، میوے بینے اور انھیں ایک جگہ جمع کر کے اپنے بچے سے کہا: ''مور پتوا! (یعنی میرے بیٹے) یہیں بیٹھا رہ۔ اِدھر اُدھر جائیو مت۔ تو اُدھر ہوا تو کوّے سارے میوے کھا جائیں گے۔ میوے میرے گِنے ہوئے ہیں۔ دیکھ، ایک بھی کم نہ ہو۔''

بچے نے وہاں سے نہ ہٹنے کی ہامی بھر لی اور فاختہ کو اپنے کام سے جہاں جانا

تھا، چلی گئی۔

بچہ اپنی ماں کا اتنا فرماں بردار تھا کہ بھوکا پیاسا دن بھر دھوپ میں میووں کے ڈھیر کے پاس بیٹھا رہا اور اس کی نگہبانی کرتا رہا، اسی لیے وہاں نہ مینائیں آئیں، نہ کوے، نہ دوسری فاختائیں۔

شام کو جب فاختہ لوٹی تو اپنے ذخیرے کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا کہ میں تو اتنا بڑا ڈھیر چھوڑ کر گئی تھی، یہ تو اتنے سے ہیں کہ ان پر اگر پیر پھیلا کر بیٹھوں تو یہ انڈے کی طرح چھپ جائیں گے۔ ضرور بچوا اِدھر اُدھر چلا گیا ہوگا یا اور فاختاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیل میں لگ گیا ہوگا کہ کوے، مینائیں آ کر انھیں کھاتے رہے۔

کبھی سوچتی یا خود کھائے ہوں گے۔

وہ جتنا سوچتی تھی، اس کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ آخر اس نے بچے سے پوچھا: ''باقی میوے کیا ہوئے؟''

اس نے کہا: ''اتنے ہی تھے اماں!''

فاختہ نے طیش میں کہا: ''تُو جھوٹ بولتا ہے۔''

جتنا وہ اپنی صفائی میں کچھ کہتا، اتنا ہی فاختہ کے غصے کا پارا چڑھتا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ آپے میں نہیں رہی۔ اس نے بچے کو پہلے اپنے پنجوں سے مارا اور پھر اتنی ٹھونگیں ماریں کہ وہ بے دم ہو کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب فاختہ کا غصہ کم ہوا تو اس نے سوچا، لاؤ گن کر دیکھوں کتنے میوے بچے ہیں۔

اور جب اس نے انھیں گنا تو جیسے اس کا سارا خون ایک دم سوکھ گیا اور اُسے لگا گردن اور پنجوں سے جان نکل گئی۔ وہ تو اتنے ہی تھے، جتنے چھوڑ کر گئی تھی۔ بس دن بھر کی دھوپ سے سکڑ گئے تھے۔

اس نے بچے کے پاس جا کر اُسے منانے کی کوشش کی، کبھی ایک پنجے سے کبھی دوسرے سے، کبھی اپنی چونچ اس کی گردن اور سر پر ایک طرف سے پھیرتی، کبھی دوسری طرف سے۔ ساتھ ہی ساتھ اُسے پکارتی جاتی: ''پتّو، پتّو، اُٹھ میوے پورے ہیں۔ ایک بھی کم نہیں ہوا۔'' ساتھ ہی روتی بھی جا رہی تھی اور جب وہ نہیں اُٹھا تو اس نے جھنجلا کر کہا: ''پتّو! اُٹھ۔'' اور اُسے پنجے سے زور سے ہلایا، جیسے سوتے سے جگایا کرتی تھی، لیکن اس کا سر مٹی کے ڈھیلے کی طرح نیچے گر پڑا۔ وہ بے چارہ کب کا مر چکا تھا۔

اس دن سے وہ صبح سے شام تک اُسے پکارتی رہتی ہے: ''پتو اُٹھو، پتو اُٹھو، پتو اُٹھو میوے پور پور، میوے پور پور، پتو اُٹھو، پتو اُٹھو، پتو اُٹھو۔ میوے پور پور، میوے پور، پور۔''

کہانی کا آخری حصہ سنتے ہوئے جواد نے بہت چاہا، اس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہیں لیکن اس کی ماں دیکھ سکتی تھیں کہ اس کی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ کہانی کا آخری حصہ سناتے ہوئے وہ خود گلوگیر تھیں۔ آج اتنے سالوں بعد اپنی ماں کی سنائی ہوئی کہانی انھیں یاد آئی تھی، وہ بیٹے کی طرف دیکھے بغیر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

کافی دیر بعد جواد کے دماغ سے وہ دُکھ ہٹا، جو ایک ماں کی بدگمانی اور پچھتاوے کی کہانی نے اسے پہنچایا تھا۔ اس نے انگلیوں سے آنکھیں پونچھیں اور ادھر ادھر سر گھما کر

دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اس وقت اس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ خود یہ کہانی کسی دوسرے کو سنائے اور اس کے لیے اس کے دوست موسیٰ سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔

جواد کا اسکول جانا ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ایک حافظ جی صبح ناشتے سے بھی پہلے قرآن مجید پڑھانے آتے تھے اور ایک ماسٹر صاحب اردو، انگلش اور حساب پڑھانے شام کو۔

اس نے سوچ سوچ کر پوری کہانی کاپی سے ایک ورق پھاڑ کر اس پر لکھی اور یہی نہیں اس میں میووں کی تعداد کا اضافہ بھی کر دیا۔ ۱۲۱ تھے، پیلے چھوٹے انگوروں کے رنگ کے، اور فاختہ کے بچے کو چونچ اور پنجوں سے مارنے کے بعد اس نے لکھا: تب بھی ۱۲۱ تھے۔ ایک بھی کم نہیں ہوا تھا۔ بچے کا رنگ بھی لکھا، پہلے گلابی تھا، بعد میں وہ مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا اور اُسے چونٹیاں لگ رہی تھیں اور امی فاختہ اُسے اس حال میں دیکھ دیکھ کر رو رہی تھیں۔

خط ختم ہونے کے بعد دوسرا مرحلہ اسے لفافے میں بند کرنے کا تھا۔ ویسا لفافہ تو وہ بنا نہیں سکتا تھا، جس پر ٹکٹ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ہاں ویسا لفافہ ممکن تھا، جس پر ٹکٹ چپکایا جاتا ہے۔ نوٹ بک سے ایک اور ورق پھاڑ کر اس نے لفافہ بنایا، جیسے اس نے ابا کے پاس آتے دیکھے تھے اور باورچی خانے سے گندھا ہوا آٹا لا کر اسے تین طرف سے چپکایا۔ اس میں اپنا خط رکھا اور لفافے کو بند کر دیا۔

لفافے پر موسیٰ کا پتا لکھنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کی ماں اسی سے اپنا لفافہ یا پوسٹ کارڈ اپنی بڑی بہن کے نام پوسٹ کرواتی تھیں اور وہ اُسے زبانی یاد ہو گیا تھا۔

موسیٰ کے باپ کا نام، محلہ اور شہر۔ ایک جدت اس نے یہ کی کہ پتے کے اوپر ڈاک کے ٹکٹ کی تصویر بنائی اور اس پر قیمت کا ہندسہ انگریزی میں لکھنا، وہ نہیں بھولا۔ اب ہر کام مکمل تھا۔

خط پوسٹ کرنے کے بعد جواد خوش تھا کہ کچھ دن بعد موسیٰ کا خط آئے گا۔ اس میں اس نے دل کھول کر اس کہانی کی تعریف کی ہوگی اور آخر میں لکھا ہوگا: تم نے اتنی دردناک کہانی سُنا کر، معاف کرنا لکھ کر مجھے رُلا دیا اور موسیٰ کا خط جب امی ابا دیکھیں گے انھیں تعجب ہوگا کہ تم نے یہ سب کام کب اور کیسے کیا؟

لیکن ہفتہ بیتا، دس دن گزر گئے، لیکن موسیٰ کا خط نہیں آیا۔ ہاں، امی کی بڑی بہن کا خط اپنی بہن کے نام ضرور آیا، لیکن اس میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں تھا کہ موسیٰ کو جواد کا خط ملا۔

اُن کے اس خط کو امی سے سن کر اور پھر خود پڑھ کر جواد روہانسا ہو گیا۔ ایک تو خط پر اتنی محنت کے رائیگاں جانے کا افسوس، دوسرے، کہانی کو کسی کو سنانے کی آرزو اپنی جگہ پر تھی۔ اس نے دل میں وہ محاورے دہرائے، جنھیں کتابوں میں پڑھتا اور بڑوں سے سنتا آیا تھا۔ ناکامی پر رو دینا بزدلوں کا کام ہے، کیے جاؤ کوشش میرے دوستو۔

اس نے ایک بار پھر وہی سارا کام کیا جو پہلے کیا تھا۔ کہانی بھی لکھی۔ لفافہ بھی تیار کیا اور ایک نیا کام یہ کیا کہ ابا کے نام آنے والے ایک لفافے سے جسے انھوں نے مروڑ کر پھینک دیا تھا، انھی کی طرح کیتلی کی ٹونٹی سے نکلنے والی بھاپ دکھا کر ٹکٹ اُتارا اور اُسے اپنے لفافے پر چپکا دیا۔ ایک بار جواد کے پوچھنے پر کہ آپ ٹکٹ لفافوں سے

کیوں اُتارتے ہیں؟ انھوں نے کہا تھا کہ سب نہیں بس، خاص خاص باہر کے ملکوں کے ڈاک کے ٹکٹ میں جمع کرتا ہوں۔

ایک کام اور بھی اس نے اس بار کیا، جو پہلے کرنا بھول گیا تھا۔ لفافے کی پشت پر اپنے گھر کا پتا بھی ابا کے نام آنے والے اس خط سے نقل کر دیا اور جا کر لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

اس دفعہ اس کے جواب کے لیے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ خط پوسٹ کرنے کے تیسرے دن جواد حافظ جی کے جانے اور ناشتا کرنے کے بعد اپنی چھوٹی بہن سے سانپ اور سیڑھیوں کا کھیل کھیل رہا تھا کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ماں کے کہنے پر اس نے دروازے پر جا کر کھٹکا کرنے والے کو دیکھا۔ وہ ڈاکیا تھا، مگر ہمیشہ کی طرح خط اندر ڈال کر چلا نہیں گیا تھا۔ جواد کے مُنھ سے نکلا: ''کیا کام ہے؟''

ڈاکیے نے کہا: ''تمھیں اور تمھارے گھر کے کسی بڑے کو پوسٹ ماسٹر صاحب نے پوسٹ آفس آنے کو کہا ہے۔'' ڈاکیے کی بات سن کر جواد کی ماں نے کہا: ''کیا بات ہے؟ جو کہنا ہے کیا وہ تم یہاں نہیں کہہ سکتے۔''

''وہ تفتیش کرنی ہے۔'' ڈاکیے نے کہا۔

''کاہے کی؟'' جواد کی ماں نے پوچھا۔

''اس گھر میں ایک جرم ہوا ہے۔'' پوسٹ مین نے کہا: ''ایک پرانے ٹھپا لگے ہوئے ٹکٹ کو لفافے پر لگا کر سرکار کو دھوکا دینے کا جرم۔''

''بھیجنے والے کا نام؟'' جواد کی ماں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

''اسی گھر کے کسی فرد نے یہ جرم کیا ہے۔'' اور چلتے چلتے ڈاکیا کہہ گیا: ''پوسٹ آفس پہنچنا ضروری ہے۔ چار بجے بند ہونے سے پہلے۔''

جس زمانے کا یہ ذکر ہے، گھر گھر ٹیلے وژن اور ٹیلی فون تو نہیں تھے، لیکن سرکار کے قانون کو توڑنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔

جب دو بجے کے قریب جاوید کے ابا ڈیوٹی سے لوٹے تو پورا گھر سکتے میں تھا۔ بات سن کر وہ سناٹے میں آ گئے۔ انھوں نے جواد سے پوچھا: ''تم نے کچھ کیا ہے؟''

جواب میں ماں نے کہا: ''اس بے چارے کو کیا معلوم جرم کیا ہوتا ہے۔ کسی اور نے کیا ہوگا، نام اس کا لگا دیا۔''

لیکن جواد نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''خط میں نے ڈالا تھا اور وہ ٹکٹ آپ کے لفافے سے چھڑا کر میں نے اس پر لگایا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جواد کے باپ نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور کہا: ''چلو۔'' اور گھر سے نکل گئے۔ اندر سے وہ بھی ڈرے ہوئے تھے۔

اس کی ماں کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا کہ نجانے کیا ہونے والا ہے۔ انھوں نے دعا پڑھ کر بیٹے پر پھونکی، کچھ اور نہیں کہا۔

پوسٹ آفس میں داخل ہونے کے بعد جب دونوں پوسٹ ماسٹر کے سامنے پہنچے تو انھوں نے کہا: ''تشریف رکھیے۔'' دو لفافے میز کی دراز سے نکال کر اپنے سامنے رکھے اور مسکراتے ہوئے جواد سے کہا: ''اچھا تو یہ آپ ہیں۔'' جواد خوف سے کانپ اُٹھا کہ ابھی یہ کسی پولیس والے کو بلائیں گے اور وہ مجھے پکڑ کر سیدھا تھانے لے جائے گا۔

مگر پوسٹ ماسٹر نے اس سے نرمی سے کہا: ''پانی پییں گے؟''

جواد کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہے۔ اس کے ابا بھی شرمندہ سے بیٹھے تھے جیسے یہ دھوکا دہی کا کام انھوں ہی نے کیا ہے۔

جواد نے گڑگڑا کر کہا: ''آیندہ کسی کو خط نہیں لکھوں گا۔''

پوسٹ ماسٹر نے ہنستے ہوئے کہا: ''کہانی تو یہ اچھی ہے، مگر بیٹا! یہ خط ایسے تو نہیں پہنچے گا!''

''پھر؟''

''خط بھیجنے کے لیے پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔'' ساتھ ہی انھوں نے جواد کے باپ سے پوچھا: ''چاے پییں گے؟'' انھوں نے کہا: ''شکریہ۔''

جواد کو جیسے پولیس سے بچنے کی آس بندھی۔ اس نے لجاجت سے کہا: آیندہ پیسے امی سے لے کر لفافے میں رکھا کروں گا۔''

''اس سے لفافہ پھٹ جائے گا۔''

اب پوسٹ مین اور پوسٹ آفس میں کام کرنے والے دو تین اور افراد اس عجیب پیشی کی کارروائی کو دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ابا کے چہرے کا کھنچاؤ بھی دور ہو گیا تھا اور وہ پوسٹ ماسٹر کو تشکر کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

جواد نے بڑھتی ہوئی گھبراہٹ میں کہا: ''نہیں، لفافہ بند کرنے سے پہلے اس میں نوٹ رکھ دوں گا۔'' سب ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

پوسٹ ماسٹر نے کہا: ''بے چارے پوسٹ مین کو کیسے پتا چلے گا کہ ڈاک کا ٹکٹ

جو لگنا چاہیے تھا، اس کے پیسے لفافے کے اندر بند ہیں۔''

''پھر میں لفافہ بند نہیں کروں گا۔'' جواد جواب دینے سے عاجز ہوتا جا رہا تھا۔

سب کی ہنسی میں اب ابا جی بھی شامل ہو گئے تھے۔

پوسٹ ماسٹر نے کہا: ''میں بتاتا ہوں، آپ کو کیا کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے ایک سادہ لفافہ لیا۔ ویسا نہیں جس پر ٹکٹ چھپا ہوتا ہے۔ جواد کے دونوں خط لفافوں سے نکالے اور بولے: ''ان دونوں میں سے کون سا آپ اپنے دوست کو بھیجنا چاہتے ہیں؟''

''کوئی سا بھی۔'' جواد نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

پوسٹ ماسٹر نے دونوں خطوں کو پڑھا اور جیسے بڑبڑائے: ''یہ بہتر رہے گا۔''

خط کو لفافے میں بند کر کے انھوں نے اس پر وہی دو پتے آگے اور پیچھے لکھے جو جواد کے دوسرے لفافے پر تھے، پھر ایک رجسٹر کو کھول کر اس میں سے ایک کاغذ نکالا جو ایک طرف سے رنگین تھا اور دوسری طرف اس پر گوند کی تہ تھی۔ یہی نہیں اس میں اوپر سے نیچے اور ایک طرف سے دوسری طرف کو سیدھی لائنوں میں چھید ہی چھید تھے۔ پھر انھوں نے احتیاط سے اس میں سے ایک چوکور سے ٹکڑے کو باقی کاغذ سے جدا کیا۔

''اچھا تو یہ......'' اتنی بات کہہ کر وہ رک گیا۔

پوسٹ ماسٹر نے جی کہہ کر اسٹامپ کی پشت پر اُنگلی سے پانی لگا کر اُسے لفافے پر چپکا دیا اور اُسے تھماتے ہوئے بولے: ''یہ باہر لیٹر بکس میں ڈال دیجیے۔ دیکھیں، یہ پہنچتا ہے یا نہیں اور جب پہنچ جائے تو اپنے ابا سے پوچھیے گا، یہ کیسے پہنچ گیا اور میرے پہلے خط کیوں نہیں پہنچے تھے۔''

جواد بھی اب خود کو اس کھیل میں شریک پا رہا تھا۔ وہ تیزی سے باہر گیا اور لیٹر بکس میں خط ڈال کر جب لوٹا تو اس نے دیکھا۔ اس کے باپ شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں ڈاک کے ٹکٹ کے پیسے دینے جا رہے تھے، لیکن انھوں نے اپنا بچہ ہے کہہ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ ایک ہفتے بعد جواد دوڑتا ہوا پوسٹ آفس آیا کہ پوسٹ ماسٹر صاحب کو یہ خوش خبری سنائے کہ موسیٰ کو اس کا خط مل گیا اور کہانی اُسے بہت پسند آئی، لیکن میز پر ان کی جگہ کوئی اور صاحب بیٹھے تھے۔

پوسٹ مین نے جو ڈاک بانٹ کر ابھی پوسٹ آفس آیا تھا، اس سے کہا: ''خوش خبری سنانے آئے ہو؟''

جواد نے ہاں میں سر ہلایا۔

ڈاکیے نے رنج سے سر ہلاتے ہوئے کہا: ''ان کا تو تبادلہ ہو گیا۔''

''کہاں؟''

''وہ دوسرے شہر چلے گئے۔'' ☆

نظمیں بھیجنے والے

نظمیں بھیجنے والے نونہال یہ وضاحت کر دیا کریں کہ نظم انھوں نے خود لکھی ہے۔ اگر خود لکھی ہے تو پہلے اپنے استاد یا کسی شاعر کو دکھا کر ضرورت کے مطابق اصلاح و درستی کرا لیں۔

نظم اگر کسی دوسرے شاعر کی ہے تو اس شاعر کا نام ضرور لکھیے۔ اس صورت میں ہم شاعر کے نام کے ساتھ نظم بھیجنے والے نونہال کے نام سے پہلے ''پسند'' کا اضافہ کر دیں گے۔ اگر آپ نظم لکھنے والے شاعر کا نام نہیں لکھیں گے تو نظم شائع نہیں کریں گے۔ ☆

ڈولفن - انسان کی مخلص دوست

محمد حسنات حمید

آپ نے اخبارات و رسائل میں چھپنے والی تصویروں اور سینما ہال اور ٹیلے وژن پر دکھائی جانے والی فلموں میں ایک لمبوترے سے منھ اور گول مٹول جسم والی سیاہ رنگ کی مچھلی کو ضرور دیکھا ہوگا۔ اسے ''ڈولفن مچھلی'' کہتے ہیں۔ یہ سمندر کی ذہین ترین مخلوق ہے۔ یہ دنیا کا وہ واحد جانور ہے، جس کا دماغ انسانی دماغ سے بڑا ہے۔

ڈولفن انسان سے بے حد محبت کرتی ہے۔ اس وجہ سے انسان سے دور رہنا ڈولفن کو پسند نہیں۔ ڈولفن کو مچھلیوں سے زیادہ انسان سے محبت ہے۔ اس نے بارہا مچھیروں کی مدد کی ہے۔ جب وہ مچھیروں کو مایوس ہوتے دیکھتی ہے تو سمندر کی بہت سی مچھلیوں کو ہانک کر جال کے سامنے لے آتی ہے۔ اگر کوئی ڈولفن پھنس جائے تو چھڑانے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

یونانی مفکر ارسطو نے ایک ایسی ڈولفن کا ذکر کیا ہے، جو ایک بچے کو اپنے اوپر بٹھا کر جھیل کے اس پار چھوڑنے جایا کرتی تھی۔ یہ بچہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ چھٹی کے وقت یہ مچھلی بچے کا ایک خاص مقام پر انتظار کرتی۔ جب بچہ آجاتا تو اس کو بٹھا کر واپس لے آتی۔ وہ اس بچے سے بہت پیار کرتی اور اکثر اپنے ننھے دوست کے ساتھ کھیلا کرتی۔

ڈولفن بھی انسانوں کی طرح اپنی بستیاں بناتی ہیں۔ سمندر میں جابجا ان کے گھر ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے بچوں سے بہت پیار ہوتا ہے۔ وہ بڑی محنت سے بچوں کی پرورش

کرتی ہیں۔ اگر کوئی مچھلی بیمار پڑ جائے تو بستی کی تمام مچھلیاں اس کی دیکھ بھال کرنے آتی ہیں اور اسے شکار لا کر دیتی ہیں۔

انسان کے علاوہ ڈولفن بھی شاید دنیا کی وہ واحد مخلوق ہے، جسے نمونیا اور دل ودماغ کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ کئی ڈولفن مچھلیاں دل کے دورے سے مرجاتی ہیں۔ دل کے دورے کا سبب عموماً کوئی گہرا صدمہ ہوتا ہے۔ بعض ڈولفن مچھلیاں پاگل بھی ہو جاتی ہیں۔

ڈولفن کی رفتار عموماً ۵۰ سے ۱۰۰ کلو میٹر فی گھنٹا تک ہوتی ہے۔ ڈولفن مچھلیوں کے سننے کی حس حیرت انگیز حد تک تیز ہوتی ہے۔ اگر آپ ڈولفن کے لیے پانی میں انگور کا ایک دانہ پھینکیں تو وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ اسے اُٹھا لائے گی۔ اس دانے تک جانے کے لیے ڈولفن اپنی آنکھوں کے بجائے کانوں سے کام لیتی ہے۔ پانی میں انگور کے

ڈوبنے سے نہایت مدھم سی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے، جو ۴۰ کلومیٹر دور کھڑی ڈولفن کو خبردار کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

دوسری مچھلیوں کے برعکس ڈولفن کے بچے بہت کم ہوتے ہیں۔ سمندروں میں سے ڈولفن مچھلیوں کو چن چن کر پکڑ لیا گیا، یا پانی کی آلودگی کی وجہ سے وہ رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں۔ چناں چہ اب یہ مچھلیاں شاذو نادر ہی ملتی ہیں۔ اگر ڈولفن کے تحفظ کے انتظامات نہ کیے گئے تو انسان بہت جلد ایک مخلص دوست سے محروم ہو جائے گا۔ ☆

آپ کی تحریر کیوں نہیں چھپتی؟

اس لیے کہ تحریر: ◆ دل چسپ نہیں تھی۔ ◆ بامقصد نہیں تھی۔ ◆ طویل تھی۔ ◆ صحیح الفاظ میں نہیں تھی۔ ◆ صاف صاف نہیں لکھی تھی۔ ◆ پنسل سے لکھی تھی۔ ◆ ایک سطر چھوڑ کر نہیں لکھی تھی۔ صفحے کے دونوں طرف لکھی تھی۔ ◆ نام اور پتا صاف نہیں لکھا تھا۔ ◆ اصل کے بجائے فوٹو کاپی بھیجی تھی۔ ◆ نونہالوں کے لیے مناسب نہیں تھی۔ ◆ پہلے کہیں چھپ چکی تھی۔ ◆ معلوماتی تحریروں کے بارے میں یہ نہیں لکھا تھا کہ معلومات کہاں سے لی ہیں۔ ◆ نصابی کتاب سے بھیجی تھی۔ ◆ چھوٹی چھوٹی کئی چیزیں مثلاً شعر، لطیفہ، اقوال وغیرہ ایک ہی صفحہ پر لکھے تھے۔

تحریر چھپوانے والے نونہال یاد رکھیں کہ

◆ ہر تحریر کے نیچے نام پتا صاف صاف لکھا ہو۔ ◆ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ہرگز نہ لکھیے۔ ◆ تحریر بھیجنے سے پہلے یہ نہ پوچھیں کہ "کیا یہ چھپ جائے گی؟" ◆ مختصر صاف لکھی ہوئی تحریر کے باری جلد آتی ہے۔ ◆ نظم کسی بڑے سے اصلاح کر کے بھیجیے۔ ◆ نونہال مصور کے لیے تصویر کم از کم کاپی سائز کے سفید موٹے کاغذ پر گہرے رنگوں میں بنی ہو۔ ◆ تصویر کے اوپر نام نہ لکھیے بلکہ تصویر کے پیچھے لکھیے۔ ◆ تصویر خانہ کے لیے بھیجی گئی تصویریں جب ماہرین مسترد کر دیتے ہیں تو وہ ضائع ہو جاتی ہیں۔ واپس منگوانا چاہتے ہوں تو پتے کے ساتھ جوابی لفافہ ساتھ بھیجیے۔ ◆ تصویر کے پیچھے بچے کا نام اور جگہ کا نام ضرور لکھیے۔ ◆ بیت بازی کا ہر شعر الگ کاغذ پر ٹھیک ٹھیک لکھ کر شاعر کا صحیح نام ضرور لکھیے۔ ◆ ہنسی گھر کے لیے ہر لطیفہ الگ کاغذ پر لکھیے۔ ◆ لطیفے گھسے پٹے نہ ہوں۔ ◆ روشن خیالات کے لیے ہر قول الگ کاغذ پر لکھیے۔ ◆ قول بہت مشکل نہ ہو۔ ◆ علم دریچے کے لیے جہاں سے بھی کوئی ٹکڑا لیا ہو، اس کا حوالہ اور مصنف کا نام ضرور لکھیے۔ ◆ تحریر کسی مخصوص فرقے، طبقے یا ملکی قانون کے خلاف نہ ہو۔ ◆ طنزیہ اور مزاحیہ مضمون شائستہ ہو، کسی کا مذاق اڑانے یا دل دکھانے والا نہ ہو۔ ◆ نونہال بلا عنوان کہانی نہ بھیجیں۔ ◆ تحریر کی نقل اپنے پاس رکھیے تاکہ چھپنے کے بعد ملا کر دیکھ سکیں کہ تحریر میں کیا کیا تبدیلی کی گئی ہے۔ ◆ اشاعت سے معذرت میں صرف کہانیوں اور مضامین کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ◆ باقی چھوٹی چھوٹی تحریریں ناقابل اشاعت ہونے پر ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ◆ تحریر، تصویر وغیرہ ارسال کرنے کا طریقہ وہی ہے جو خط بھیجنے کا ہے۔ ◆ کوپن اور کسی بھی تحریر پر صرف ایک نام لکھیے۔ ◆ اچھی تحریر لکھنے کے لیے زیادہ مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

مسکراتی لکیریں

Ghazala

''ہاتھی اور مچھر میں کیا فرق ہے؟''

''مچھر ہاتھی کو کاٹ سکتا ہے، مگر ہاتھی مچھر کو کاٹ نہیں سکتا۔''

مرسلہ : بیگر بہار، بل نگور

سیانا کوا

جاوید بسام

ایک رات جنگل میں تیز بارش ہوئی اور خوب ہوائیں چلیں، جس سے بہت سے پرندوں کے گھونسلے گر گئے اور ان کے انڈے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ دوسرے دن جب سورج نکلا، تو وہ اپنے نقصان پر چونچیں پروں میں دبائے اداسی سے خاموش بیٹھے تھے۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ ہوا بھی بند تھی۔ ایسے میں اچانک فضا میں ٹک ٹک ٹک ٹک کی آواز بلند ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی لکڑی کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ وہ ایک کھٹ بڑھئی تھا، جو ایک درخت میں اپنی مضبوط چونچ سے گھر بنا رہا تھا۔ اس کی سرخ کلغی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ وہ مسلسل ایک ہی جگہ پر اپنی چونچ مار رہا تھا۔ اسی دوران کہیں

سے ایک کوا اُڑتا ہوا اُدھر آ نکلا اور سامنے کے درخت پر بیٹھ کر غور سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا: ''تم اپنا گھر کتنی دیر میں بنا لیتے ہو؟''

کھٹ بڑھئی نے گردن گھما کر اسے دیکھا، لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

اسی طرح دوپہر ہو گئی۔ کوا اب بھی وہاں موجود تھا۔ کبھی وہ عادت کے مطابق کائیں کائیں کرنے لگتا، کبھی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چلا جاتا اور پھر کھٹ بڑھئی کو دیکھنے لگتا، آخر کھٹ بڑھئی نے کام روک دیا اور شاخ پر بیٹھ کر سستانے لگا۔ کوا پَر پھڑ پھڑاتا اس کے پاس چلا آیا اور بولا: ''بھائی کھٹ بڑھئی! تمھیں اپنا گھر بنانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟''

''ایک دو دن لگ جاتے ہیں، لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' کھٹ بڑھئی نے پوچھا۔

کوا میٹھے لہجے میں بولا: ''تمھارا گھونسلا سب سے محفوظ اور پائیدار ہوتا ہے، جب کہ اور پرندوں کے گھونسلے بارش میں گر جاتے ہیں۔ ان کا بہت نقصان ہوتا ہے۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔'' کھٹ بڑھئی سوچتے ہوئے بولا۔

''اگر تم دوسرے پرندوں کو گھونسلا بنا کر فروخت کرو تو تمھیں بھی فائدہ ہو اور وہ بھی خوش ہو جائیں۔'' کوے نے کہا۔

''فروخت...... اس کا کیا مطلب ہے؟'' کھٹ بڑھئی نے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کوئی چیز دے کر اس کا معاوضہ لینا۔''

''معاوضہ...... یہ لفظ بھی میرے لیے نیا ہے۔'' کھٹ بڑھئی الجھ کر بولا۔

''معاوضہ یعنی صلہ، تم پرندوں کو گھر بنا کر دو۔ وہ بدلے میں تمھیں معاوضہ دیں گے۔'' کوا بولا۔ وہ بہت عرصے سے انسانوں کے ساتھ رہتا آیا تھا، اس لیے نت نئے الفاظ اور باتیں جانتا تھا۔

''وہ معاوضہ کیا ہوگا؟'' کھٹ بڑھئی نے پوچھا۔

کوے نے چالاکی سے کہا: ''مجھے معلوم ہے، تمھیں سرخ رس بھریاں بہت پسند ہیں اور مجھے پنیر بہت بھاتا ہے۔ ہم ان گھروں کے بدلے پرندوں سے دس رس بھریاں اور پنیر کا ایک ٹکڑا منگوائیں گے۔'' کوے نے فوراً شراکت قائم کر لی تھی۔

''لیکن پرندے وہ کہاں سے لائیں گے؟''

کوا بولا: ''جنگل کے باہر کچھ گاؤں ہیں۔ وہاں لوگ پنیر بناتے ہیں۔ پنیر وہاں سے آئے گا اور رس بھریوں کے پودے پہاڑوں کے دوسری طرف ہیں۔ رس بھریاں وہاں سے آئیں گی۔''

''تمھارا مشورہ تو اچھا ہے۔'' کھٹ بڑھئی بولا۔

کوے نے کہا: ''تو بس آج سے ہم دوست اور شراکت دار ہیں۔ تم گھر بناتے جاؤ، باقی کام میں سنبھال لوں گا۔''

جب گھر تیار ہو گیا تو کوے نے ایک بڑے پتے پر ''برائے فروخت'' لکھ کر پتا گھر کے قریب چپکا دیا۔ پھر دونوں سامنے درخت پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہاں ایک توتا آیا۔ اس نے پتے پر لکھی تحریر پڑھی اور بولا: ''اس کا کیا مطلب ہے؟''

کوے نے کہا: ''اس کا مطلب ہے تمھیں یہ گھر مل سکتا ہے، لیکن مفت نہیں۔ تمھیں پنیر کا ایک ٹکڑا اور دس سرخ رس بھریاں لانی ہوں گی۔''

توتا کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا: ''میں تمھارا مطالبہ پورا کروں گا۔ مجھے شام تک کا وقت دو۔'' یہ کہہ کر اس نے اڑان بھری اور غائب ہو گیا۔ کوا کھٹ بڑھئی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

شام تک توتا دونوں چیزیں لے آیا۔ گھر اس کو دے دیا گیا۔ کوے اور کھٹ بڑھئی نے اپنی من پسند چیزیں مزے لے لے کر کھائیں۔ اگلے دن کھٹ بڑھئی دوسرے درخت پر گھر بنا رہا تھا۔ اس طرح وہ روز نئے گھر بناتا اور وہ گھر کبھی مینا، کبھی بلبل کو تو کبھی فاختہ کو دیے جاتے رہے۔ جب کھٹ بڑھئی اپنا کام کر رہا ہوتا تو کوا آس

پاس ہی موجود ہوتا، چوں کہ اسے روز پنیر کھانے کو مل رہا تھا، اس لیے وہ بہت خوش تھا۔اس کی صحت بھی اچھی ہوگئی تھی۔ وہ اکڑ اکڑ کر چلتا اور گردن تان کر بات کرتا تھا۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ جب کوا اپنی پنیر کھالیتا تو للچائی ہوئی نظروں سے سرخ رس بھریوں کو دیکھتا اور کھٹ بڑھئی سے پوچھتا: ''بھائی کھٹ بڑھئی! کیا میں کچھ رس بھریاں لے سکتا ہوں؟''

کھٹ بڑھئی کو کام کے دوران باتیں کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ صرف گردن ہلا دیتا، جسے کوا اجازت سمجھتا اور مزے سے رس بھریوں پر بھی ہاتھ صاف کر جاتا، آخر میں تین چار رس بھریاں ہی بچتیں، لیکن کھٹ بڑھئی دوستی کی وجہ سے خاموش رہتا تھا۔

ایک دن ان کے پاس ایک چڑیا آئی۔ وہ کچھ بیمار نظر آرہی تھی۔ وہ بولی: ''میں نے سنا ہے یہاں کھٹ بڑھئی اپنے گھر بنا کر دے رہا ہے؟''

''ہاں، لیکن مفت نہیں، تمھیں پنیر کا ایک ٹکڑا اور دس سرخ رس بھریاں لانی ہوں گی۔'' کوے نے اکڑ کر جواب دیا۔

''اچھا، میں کوشش کروں گی۔ بھائی کھٹ بڑھئی! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم میرا گھر بہت آرام دہ بنانا۔''

''ہاں ضرور، مجھے بتاؤ، تم کس درخت پر اپنا گھر بنوانا چاہتی ہو؟''

چڑیا خوش ہو کر بولی: ''مجھے گل مہر کا درخت اچھا لگتا ہے۔اس کے نارنجی پھول مجھے بہت پسند ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمھارا گھر گل مہر پر بناؤں گا۔''

قریب ہی ایک گل مہر کا درخت تھا۔ کھٹ بڑھئی نے اس پر گھر بنانا شروع

کردیا۔ چڑیا وہاں سے اڑ گئی۔

لیکن شام تک وہ صرف پانچ رس بھریاں ہی لا سکی۔ پنیر اسے بالکل نہیں ملا تھا۔ کوے نے رس بھریاں فوراً کھا لی تھیں، لیکن اپنی من پسند چیز نہ ملنے پر وہ بہت غصے میں تھا۔ چڑیا تھکے ہوئے لہجے میں بولی: ''میں کل پھر کوشش کروں گی۔''

اگلے دن کوا اور کھٹ بڑھئی گھر کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ گھر تیار ہو گیا تھا۔ کھٹ بڑھئی نے اسے محنت سے بہت آرام دہ بنایا تھا، لیکن چڑیا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کوا کچھ ناراض نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح دو پہر ہو گئی، آخر چڑیا آتی نظر آئی۔ اس کی چونچ میں ایک رس بھری دبی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اڑتی ہوئی آئی اور ان کے قریب ایک شاخ پر اتر گئی۔ پھر اس نے ہانپتے ہوئے رس بھری کوے کو دی اور سانس درست کرتے ہوئے بولی: ''میں نے بہت کوشش کی، لیکن رس بھریوں کے پودے بہت دور ہیں۔ میں تھک جاتی ہوں اور پنیر بنانے والے بھی اب ہوشیار ہو گئے ہیں۔ وہ پنیر چھپا کر رکھتے ہیں۔ میں صبح سے گاؤں کے چکر لگا رہی ہوں، لیکن مجھے کسی گھر میں بھی پنیر پڑا نظر نہیں آیا۔''

کوے نے غصے سے رس بھری دور پھینک دی اور چلا کر بولا: ''تو جاؤ! یہ گھر بھی تمھیں نہیں ملے گا۔ ہم گھر مفت میں نہیں بانٹتے۔ ہم یہ گھر کسی اور پرندے کو بیچ دیں گے۔''

چڑیا نے بہت التجا کی، لیکن کوا ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر چڑیا مایوس ہو کر واپس جانے لگی تو کھٹ بڑھئی بولا: ''ٹھیرو! تمھیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ گھر تمھارا ہے۔ تم ہی اس میں رہو گی۔''

کوے نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا: ''لیکن ہم گھر مفت میں نہیں دیتے۔''

''یہ گھر میں بناتا ہوں۔ یہ کس طرح دینے ہیں، اس کا فیصلہ بھی میں کروں گا۔'' گھٹ بڑھئی ٹھوس لہجے میں بولا۔

''لیکن ہم دوست اور شراکت دار ہیں۔'' کوا تیزی سے بولا۔

''ہیں نہیں، بلکہ تھے۔ آج سے ہماری شراکت ختم۔'' کھٹ بڑھئی نے غصے سے کہا۔

کوے نے جب بات بگڑتی دیکھی تو چاپلوسی پر اتر آیا اور بولا: ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ بے چاری چڑیا کم زور ہے۔ ہم اسے گھر ایسے ہی دے دیتے ہیں۔ اس کی مدد ہو جائے گی، لیکن ہم دوسرے پرندوں کو گھر معاوضے پر ہی دیں گے۔''

گھٹ بڑھئی حتمی لہجے میں بولا: ''ہرگز نہیں، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں گھر صرف کم زور اور بیمار پرندوں کے لیے بنایا کروں گا اور انھیں مفت دوں گا۔ ہماری دوستی آج سے ختم ہو گئی۔ تم ایک لالچی اور سنگ دل پرندے ہو۔ چلو، اب اپنا راستہ ناپو اور آیندہ مجھے اپنی شکل نہیں دکھانا۔''

کوے نے بہت منت سماجت کی، لیکن کھٹ بڑھئی بولا: ''جس طرح میری چونچ مضبوط ہے، اسی طرح میرے فیصلے بھی اٹل ہوتے ہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

کوا اپنا سا منھ لے کر اڑ گیا۔ چڑیا نے خوش ہوتے ہوئے کھٹ بڑھئی کو ڈھیروں دعائیں دیں اور مزے سے اس گھر میں رہنے لگی۔ ☆

معلومات ہی معلومات

غلام حسین میمن

خسوف-کسوف

☆خسوف عربی میں چاند گرہن کو کہتے ہیں۔ جب دوران گردش زمین، سورج اور چاند کے درمیان آ جاتی ہے تو سورج کی روشنی چاند تک نہیں پہنچ پاتی۔ اُس وقت چاند سیاہ رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں مسلمان نماز خسوف ادا کرتے ہیں۔

اسی طرح جب چاند، زمین اور سورج کے درمیان آ جائے تو سورج پر سیاہ دھبا دکھائی دیتا ہے۔ یہ عمل سورج گرہن کہلاتا ہے اور اس موقع پر نماز کسوف ادا کی جاتی ہے۔ اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جب گرہن دیکھو تو اللہ سے ڈرو، ذکر، دعا اور استغفار کرو۔''

چاہ

☆''چاہ'' فارسی زبان میں کنویں کو کہتے ہیں۔ ''چاہِ بابل'' ایک کنواں ہے، جو بغداد سے ۵۵ میل جنوب میں واقع ہے۔ اس میں کنکر پھینکنے سے پانی کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ روایت کے مطابق دو فرشتے ہاروت اور ماروت یہاں اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ قیامت تک اُن کی یہ سزا جاری رہے گی۔

اسی طرح ''چاہِ یوسف'' شام میں طبریہ کے نزدیک واقع ہے۔ یہ کنواں حضرت یوسف علیہ السلام کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے دوسرے بیٹوں کے مقابلے میں حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ اُن کے بھائی اُن سے حسد کرتے تھے۔ ایک دن وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بہانے سے لے گئے اور خشک کنویں میں پھینک دیا۔ بعد میں ایک قافلہ وہاں سے گزرا اور وہ انھیں نکال کر مصر لے گیا۔

شاہ نامہ

''شاہ نامہ'' لکھ کر شہرت پانے والے شاعر فردوسی ۹۴۰ء میں ایران کے علاقے طوس میں پیدا ہوئے۔ شاعری وجہ شہرت بنی۔ جب وہ محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ ہوئے تو شاہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ محمود غزنوی نے ہر شعر پر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر شاہ نامہ مکمل ہونے پر انھیں صرف ۲۰ ہزار درہم دیے گئے، جس کا فردوسی کو بے حد دکھ ہوا اور وہ غزنی سے چلے گئے۔

''شاہ نامہ'' لکھنے والی دوسری مشہور شخصیت ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ہے۔ انھوں نے پاکستان کا قومی ترانہ بھی لکھا۔ حفیظ جالندھری کے شاہ نامہ کا پورا نام شاہ نامہ اسلام ہے، جو چار جلدوں میں ہے۔ اس میں اسلامی روایات کا بیان ہے۔ فردوسی کی کتاب کا نام صرف ''شاہ نامہ'' ہے۔

پہلا اُستاد

☆ ارسطو کو معلم اول (پہلا استاد) کہا جاتا ہے۔ قبل مسیح کے دور میں یونان میں پیدا ہونے والا ارسطو پہلے مفکر تھا جس نے علم طبیعیات، فلسفہ، شاعری، حیاتیات، نفسیات، اخلاقیات اور دیگر علوم پر مستند کتابیں لکھیں۔

اسی طرح مشہور مسلمان سائنس داں ابونصر فارابی کو معلم ثانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ارسطو اور افلاطون کے نظریات میں مطابقت پیدا کی۔ اس طرح وہ افلاطونی مکتب فکر کے ایک جدید اسلامی شاخ کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔ ابونصر فارابی ۸۷۳ء میں ترکستان میں پیدا ہوئے۔ ۷۷ سال کی عمر میں وہ ۹۵۰ء میں انتقال کر گئے۔

پاکستان کے بارے میں

☆ پاکستان کے قیام کو جب پچاس سال ۱۹۹۷ء میں مکمل ہوئے تو ایک پاکستانی سید قاسم محمود نے قوم کو ''انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا'' کا تحفہ دیا۔ پاکستان کے بارے میں ایک جلد میں تمام معلومات سموئے ہوئے اس انسائیکلو پیڈیا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پاکستان پر پہلا مکمل معلوماتی انسائیکلو پیڈیا ہے۔

اسی طرح قیامِ پاکستان سے لے کر مارچ ۲۰۱۰ء تک کے واقعات کو ماہ بہ ماہ تصویری انداز میں مرتب کرنے کا سہرا عقیل عباس جعفری کے سر ہے۔ ''پاکستان کرونیکل'' کے نام سے ان کا یہ کام پاکستان کی مکمل تاریخ ہے۔

مُلک ، مَلَک ، مِلک ، مَلِک

مُلک (پیش کے ساتھ) عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی دیس یا علاقے کے ہیں۔ مَلَک (م اور ل پر زبر) یہ عربی کا لفظ ہے، جس کے معنی فرشتہ ہے۔ تیسرا لفظ مِلک (م کے نیچے زیر) عربی میں ملکیت، مال اسباب یا جاگیر کو کہتے ہیں۔ ایک اور لفظ مَلِک (میم پر زبر اور ل پر زیر) عربی میں بادشاہ، راجا، حاکم یا فرماں روا کو کہتے ہیں۔

سر سید احمد خاں

☆ سر سید احمد خاں مسلمانوں کے عظیم رہ نما تھے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر کتاب ''اسبابِ بغاوت ہند'' لکھ کر انگریزوں کی نظر میں یہ حقیقت واضح کی کہ جنگ کے اصل ذمے دار صرف مسلمان ہی نہ تھے بلکہ وہ واقعات اور حالات بھی تھے، جو دراصل انگریزوں اور ہندوؤں کے پیدا کردہ تھے۔ سر سید نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ میں مدرسے کا قیام تھا، جو انھوں نے ۱۸۷۵ء میں بنایا۔ دو سال بعد ۱۸۷۷ء میں وہ کالج کا درجہ پا گیا۔ ان کی وفات کے ۲۲ سال بعد ۱۹۲۰ء میں یونی ورسٹی بن گیا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کا تحریکِ پاکستان میں اہم کردار رہا۔ قائد اعظم محمد علی جناح ؒ نے ایک بار فرمایا تھا: ''علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، مسلم لیگ کا اسلحہ خانہ ہے۔''

سندھ کا سر سید، حسن علی آفندی کا کہا جاتا ہے، جنھوں نے سر سید احمد کی علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر ۱۸۸۵ء میں کراچی میں ''سندھ مدرسۃ الاسلام'' قائم کیا۔ یہ مدرسہ بھی اب یونی ورسٹی بن چکا ہے۔ یہاں سے قائد اعظم محمد علی جناح سمیت کئی نامور لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔ حسن علی آفندی کا مزار حیدر آباد سندھ میں ہے۔ ☆

جاں باز سپاہی

شاعر لکھنوی

اپنے وطنِ پاک کے جاں باز سپاہی
ہر گام پہ دشمن کے لیے قہرِ الٰہی

لاتے نہیں خاطر میں یہ خطرے کو اجل کے
بڑھ جاتے ہیں خود موت کو قدموں میں کچل کے
رہ جاتے ہیں کہساروں کے دل ان سے دہل کے
ہیں فوج عدو کے لیے اعلانِ تباہی
اپنے وطنِ پاک کے جان باز سپاہی

لڑتے ہیں زمینوں پہ، سمندر پہ، فضا پر
طوفاں میں کبھی ہیں تو کبھی موجِ ہوا پر
ایماں یہ رکھتے ہیں نبیؐ اور خدا پر
اسلام کی حاصل ہے انھیں پشت پناہی
اپنے وطنِ پاک کے جاں باز سپاہی

چہروں پہ لیے گردِ رہِ جنگ کا غازہ
رکھتے ہیں لہو سے چمنِ پاک کو تازہ
باطل کا نکلتا ہے جنازے پہ جنازہ
خود جنگ کے میدان یہ دیتے ہیں گواہی
اپنے وطنِ پاک کے جاں باز سپاہی

ڈٹ جائیں جہاں بڑھ کے، یہ ہٹتے ہی نہیں ہیں
تعداد میں کم ہو کے بھی گھٹتے ہی نہیں ہیں
بے فتح یہ میداں سے پلٹتے ہی نہیں ہیں
منزل ہی پہ دم لیتے ہیں، منزل کے یہ راہی
اپنے وطنِ پاک کے جاں باز سپاہی
ہر گام پہ دشمن کے لیے قہرِ الٰہی

ایک کہانی اور سنا دو، ایک کہانی اور

حامد اللہ افسر

ایک کہانی اور سنا دو ایک کہانی اور
ایک کہانی ، ایک کہانی ، اچھی نانی اور

لال پری آکاش سے اُتری پریوں کے راجا کی پُتری
ایک محل کی چھت پر آئی چھت پر ناچی ، چھت پر گائی
یہ تو بتادو ، اس نے دل میں کیا تھی ٹھانی اور
ایک کہانی ، ایک کہانی ، اچھی نانی اور

ملا نصر الدین کہاں ہیں کیا وہ کسی کے پھر مہماں ہیں
ان کی باتیں کہہ کے ہنسا دو ایک دفعہ پھر آج ہنسا دو
عقل کو شرما دینے والی اک نادانی اور
ایک کہانی ، ایک کہانی ، اچھی نانی اور

بال جلا کر دیو بلاؤ اس سے کہو ، اک محل بناؤ
محل میں لاکھوں پریاں آئیں اور محل لے کر اُڑ جائیں
بڑھ جائے جس سے ہماری کچھ حیرانی اور
ایک کہانی ، ایک کہانی ، اچھی نانی اور

گدھا

محشر بدایونی

دیکھو مجھے بچو! ذرا میں ہوں گدھا ، پورا گدھا
انسان حاکم ہے مرا

ہے مختصر سی میری دُم کالے ، نکیلے میرے سُم
منھ ہے مرا لمبوترا

تگڑا ہوں ، میں موٹا ہوں میں قد میں ذرا چھوٹا ہوں میں
قد میں جو چھوٹا ہوں تو کیا

گھوڑے کا رشتے دار ہوں خچر میاں کا یار ہوں
ہے زیبرا میرا چچا

جب ڈھینچوں ڈھینچوں تم سنو میں آ گیا ، بس جان لو
لکھ لو یہی میرا پتا

گاڑی ربر ٹائر بری جب ہوگیا ، ون ٹو تھری
کھائی کلفٹن کی ہوا

دیکھو ، مجھے بچو! ذرا میں ہوں گدھا ، پورا گدھا
انسان حاکم ہے مرا

وطن کا سپاہی

قمر ہاشمی

کٹھن راہِ منزل ، جواں عزمِ راہی
سویرے نے کاٹی ہے شب کی سیاہی
یہی ہے قیادت ، یہی سربراہی
وطن کا ہر اک نوجواں ہے سپاہی

وطن پر کوئی آنچ آنے نہ دوں گا
نظر تک کسی کو جمانے نہ دوں گا
میں دشمن کو ہاتھوں سے جانے نہ دوں گا
وطن کا ہر اک نوجواں ہے سپاہی

یہ بستی ، یہ بَن ، یہ وطن ہے ہمارا
چمن یہ ہمارے ، لہو نے پکارا
مصیبت میں بھی کوئی ہمت نہ ہارا
وطن کا ہر اک نوجواں ہے سپاہی

ہمارے لیے ہیں وطن میں پناہیں
یہی جاں نثاروں کی ہیں بارگاہیں
محافظ ہیں جن کی ، ہماری نگاہیں
وطن کا ہر اک نوجواں ہے سپاہی

علم دریچے

زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیے اور اچھی اچھی مختصر تحریریں جو آپ پڑھیں، وہ صاف نقل کر کے یا اس تحریر کی فوٹو کاپی ہمیں بھیج دیں، مگر اپنے نام کے علاوہ اصل تحریر لکھنے والے کا نام بھی ضرور لکھیں۔

نعتِ رسولِ مقبولؐ

شاعر : فاضل عثمانی

انتخاب : عفرا سہیل، جگہ نامعلوم

اور ثنا پیارے احمدؐ کی کس منہ سے ہو
حق یہ ہے، آپؐ کی ذات ہے منفرد

حلم ، گفتار و کردار و عفو و کرم
اُنؐ کی کیا بات، ہر بات ہے منفرد

ہوئے سیراب اپنے بھی اور غیر بھی
خُلقِ احمدؐ کی برسات ہے منفرد

تذکرہ کیا کروں ان کے اوصاف کا
صبر کی ، شکر کی بات ہے منفرد

قابلِ قدر تو اور راتیں بھی ہیں
اُن میں پھر "قدر" کی رات ہے منفرد

آئے دنیا میں مصلح نبیؑ اُن میں پھر
سر بہ سر آپؐ کی ذات ہے منفرد

دیں ملا آپؐ کی ہی بدولت ہمیں
بیش قیمت یہ سوغات ہے منفرد

دوست احباب دنیا میں دیکھے تو ہیں
ان کے اصحاب کی بات ہے منفرد

تُو نے فاضل کہیں تو نعتیں بہت
مرحبا اُن میں یہ نعت ہے منفرد

انمول باتیں

مرسلہ : زین علی، کراچی

☆ سچ بولنے والی زبان کبھی نہیں لڑکھڑاتی۔

☆ دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی ہوئی آنکھیں بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔

☆ نیکی کی طرف بلانے والے کا ثواب نیکی کرنے والے کے برابر ہوتا ہے۔

☆ حق پر چلنے والے کے لیے یہ مشکل ہوتی ہے کہ اکثر وہ تنہا رہ جاتا ہے۔

☆ جس کے سینے میں قرآن نہیں ، وہ ویران مکان کی مثال ہے۔

مذاہب

تحریر : اوریا مقبول جان

مرسلہ : محمد حمزہ اشرفی، کراچی

دنیا کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں خانہ بدوشوں کے دور سے لے کر شہروں کی آبادیوں تک انسانیت اور انسانی اصولوں کا درس صرف مذاہب یا خدا کی طرف سے بھیجے گئے پیغمبروں نے دیا۔ سچ بولو، پورا تولو، قتل نہ کرو، غیبت نہ کرو، دھوکا مت دو، جانوروں پر ترس کھاؤ، درختوں کی حفاظت کرو۔ یہ سب اصول آسمانی کتابوں میں ہی ملتے ہیں۔

قوم کی سر بلندی

مرسلہ : عائشہ محمد خالد قریشی، سکھر

۱۹۴۴ء کا ذکر ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح اور گاندھی جی کے درمیان بمبئی میں مذاکرات کا پروگرام تھا۔ اس وقت قائداعظم کشمیر میں تھے۔ وہاں گاندھی جی کا پیغام پہنچا کہ کشمیر سے واپسی میں قائداعظم واردھا آجائیں۔ مذاکرات وہیں ہو جائیں گے۔ گاندھی واردھا میں مقیم ہیں، واردھا راستے میں پڑتا ہے، مگر قائداعظم نے جواب دیا کہ وہ اپنا پروگرام بدلنے سے قاصر ہیں۔ واردھا نہیں آسکتے۔ آخر گاندھی جی کو مذاکرات کے لیے بمبئی آنا ہی پڑا۔ بعد میں کسی نے قائداعظم سے کہا: ”اگر آپ واپسی میں واردھا رُک جاتے تو کیا حرج تھا؟“

قائداعظم نے جواب دیا: ”یہ کوئی ذاتی مسئلہ نہیں، قومی وقار کا معاملہ تھا۔ اگر میں گاندھی کے کہنے پر سر جھکا دیتا تو کانگریس تصویروں کے ذریعے سے دنیا بھر میں اس کی تشہیر کرتی۔ اس صورت میں میری قوم کو کیا محسوس ہوتا۔ میں اپنی قوم کو کسی کے سامنے جھکتا نہیں دیکھ سکتا۔“

کرکٹ

دلیل الرحمٰن، کراچی

دو بے وقوف دوست نیشنل اسٹیڈیم کے قریب سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگ اسٹیڈیم کے اندر جا رہے ہیں۔ وہ دونوں بھی اندر داخل ہو گئے۔ کرکٹ میچ شروع ہو چکا تھا۔ بولر نے بولنگ کرائی، بلے باز کھلاڑی نے اس گیند پر زور دار چھکا لگا دیا، گیند اسٹیڈیم کے باہر چلی گئی۔

ان میں سے ایک بے وقوف نے دوسرے بے وقوف سے کہا: ''شمش الدین بھائی! آپ نے دیکھا کہ اس کھلاڑی نے کتنا شان دار گول کیا۔''

دوسرے بے وقوف نے یہ سن کر کہا: ''بھائی، گلاب خان! جب آپ کو کھیل کے متعلق معلوم نہیں تو منھ مت کھولا کرو۔ گول اس کھیل میں نہیں ہوتا ہے، گول تو کرکٹ کے کھیل میں ہوتا ہے۔''

سینڈوچ کو یہ مخصوص نام کیسے دیا گیا؟

مرسلہ : عبدالغنی، کوئٹہ

سینڈوچ دراصل برطانیہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اٹھارویں صدی میں اس جگہ کا مالک ایک انگریز نواب ''جون مونٹا گو'' تھا۔ یہ اپنے خاندان کا چوتھا نواب تھا۔ جون مونٹا گو کو تاش کھیلنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ اکثر کھیل کے دوران کھانا کھانا بھی بھول جاتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک ترکیب نکالی اور اپنے نوکر سے کہا: ''کھیل کے دوران وہ اسے ڈبل روٹی کے بیچ میں ایک تلا ہوا گوشت کا ٹکڑا رکھ کر دے دیا کرے۔'' اس طرح موجودہ سینڈوچ کی ابتدا ہوئی۔

گرد کس چیز کی بنی ہوتی ہے؟

مرسلہ : ریحان احمد، اسلام آباد

گرد دراصل انتہائی چھوٹے چھوٹے مٹی کے وہ ذرات ہوتے ہیں، جو ریت کے ذرات سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ گرد کے

ذرات میں جانوروں کے چھوٹے چھوٹے بال اور کوڑا کرکٹ ہوا کے ذریعے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے ہیں۔ گرد کے ذرات سانس کی نالی میں جا کر صحت کو متاثر کر سکتے ہیں۔ گرد میں ایسے جراثیم بھی ہوتے ہیں، جو الرجی اور دیگر بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں۔

خدا کے خوف سے

مرسلہ : کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

ایک صاحب بے چارے اَن پڑھ تھے اور حساب کتاب انھیں بالکل نہیں آتا تھا۔ چناں چہ جب بھی رمضان آتا تو وہ بھول جاتے کہ کتنے روزے رکھے ہیں اور کتنے باقی رہ گئے ہیں۔ کسی دوسرے سے پوچھنا وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک عمدہ ترکیب نکالی۔ رمضان آتا تو روزانہ روزہ افطار کرنے کے بعد ایک گھڑے میں ایک پتھر ڈال دیتے، پھر کسی سے گنوا لیتے۔

ان کا پوتا بڑا شریر تھا۔ ایک بار وہ دو تین دن دادا کو یہ عمل کرتے دیکھتا رہا اور ایک دن بہت سارے پتھر گھڑے میں ڈال دیے۔ رمضان کے اختتام پر صوفی صاحب نے پتھر گنوائے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ صبح عید ملنے کے لیے آنے والے ایک بے تکلف دوست نے مذاقاً ان سے پوچھا: ''ہاں بھئی سناؤ! کتنے روزے رکھے اب کی بار؟''

''پچاس۔'' صوفی صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیا کہا پچاس؟''

انھیں سنجیدہ دیکھ کر دوست نے حیرت سے کہا: ''خدا کا خوف کرو، روزے تو تیس ہوتے ہیں۔''

''میں نے خدا کے خوف سے پچاس بتائے ہیں، ورنہ روزے سو سے اوپر ہو چکے ہیں۔'' صوفی صاحب نے اب بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ☆

آپ کے لیے ایک نیا اور مکمل ناول

آخری اُمید

اشتیاق احمد نے خاص نمبر کے لیے خاص لکھا

''ابا جان! گاڑی روکیے ذرا......'' فرزانہ کی آواز گاڑی میں گونج گئی۔

انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا: ''نہیں فرزانہ! گاڑی نہیں رک سکتی۔ تمھیں معلوم ہے، آئی جی صاحب نے فوراً دارالحکومت پہنچنے کا حکم دیا ہے۔''

''لیکن ابا جان! اس وقت ہم جس جگہ سے گزر رہے ہیں، اس جگہ ضرور کوئی بات ہے۔ میرے کان مجھے خبردار کر رہے ہیں اور آپ جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے کیسے کان عطا فرمائے ہیں۔ آپ بس ایک آدھ منٹ کے لیے گاڑی روک دیں۔ میں ذرا کان لگا کر غور کرلوں۔ اگر یہ میرا وہم ہوا تو ہم فوراً آگے روانہ ہو جائیں گے۔''

''اور اگر یہ تمھارا وہم نہ ہوا تو، تب بھی ہم نہیں رک سکیں گے فرزانہ! اس لیے کہ......''

''جی ہاں! میں جانتی ہوں، اس صورت میں بھی آپ نہیں رکیں گے۔ آئی جی صاحب کو شہر میں آپ کی اچانک ضرورت پیش آگئی ہے، لیکن میں اپنے کان کا کیا کروں؟''

''ان میں اُنگلیاں دے لو۔'' فاروق نے مشورہ دیا۔

''تم چپ رہو، ورنہ میں اپنی اُنگلیاں تمھارے کانوں میں دے دوں گی۔'' فرزانہ کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

''لیکن اس سے کیا ہوگا؟'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''اچھا بابا! میں گاڑی روک رہا ہوں، لیکن صرف تیس سیکنڈ کے لیے۔'' انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

''بہت بہت شکریہ ابا جان! ابا جان ہوں تو آپ جیسے۔''

''حد ہو گئی...... یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔'' انھوں نے منھ بنایا۔

گاڑی کے رکتے ہی فرزانہ نے کان لگا دیے، پھر بُری طرح اُچھلی۔

''میرے کانوں کو وہم نہیں ہوا تھا۔''

''دھت تیرے کی......'' محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

''کیا ہے فرزانہ! جلدی بتاؤ...... تیس سیکنڈ کے بجائے ایک منٹ ہو چلا ہے۔''

''یہاں...... ابا جان! یہاں کوئی عورت بہت درد بھرے انداز میں رو رہی ہے۔''

''اوہ؟'' ان سب کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

''اور تم اب اس عورت سے ملے بغیر نہیں رہ سکتیں...... تب پھر تم اُتر جاؤ۔ دارالحکومت یہاں سے صرف ڈیڑھ گھنٹے کے راستے پر ہے۔ فارغ ہوتے ہی مجھے فون کر دینا، اکرام کے کسی ماتحت کو بھیج دوں گا۔''

''جی بہت بہت شکریہ!'' فرزانہ نے خوش ہو کر کہا اور گاڑی کا دروازہ کھولتے ہی

اُتر گئی۔

''آؤ..... کیا تم نہیں اُترو گے؟'' فرزانہ جھلا اُٹھی، کیوں کہ محمود اور فاروق ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔

''رونے کی آواز تمھارے کانوں نے سنی ہے، ہمارے کانوں نے نہیں..... ہم کیوں اُتریں.....!''

''کوئی پروا نہیں..... تم نہیں اُترنا چاہتے، نہ اُترو۔''

''بُری بات ہے محمود! فاروق! اب یہ بے چاری اکیلی یہاں ٹھیرے گی!''

''تو اسے چاہیے نا ابا جان! اپنے کانوں سے اتنا کام نہ لیا کرے۔ نہ راستہ دیکھتی ہے، نہ محل۔''

''لیجیے، محاورے کی بھی ٹانگ توڑ دی..... نہ موقع دیکھتی ہے، نہ محل۔'' فاروق ہنسا۔

''وہ تم جو دیکھ لیتے ہو۔'' فرزانہ بھی ہنسی۔

''اچھا بابا!'' محمود نے جل کر کہا اور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر کار سے اُتر گیا۔ ساتھ ہی فاروق بھی اُترا۔

''اچھا بھئی، اللہ حافظ۔ موبائل آن رکھنا۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔

''ضرور! ان شاء اللہ ابا جان!''

وہ کار کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتے رہے۔ تین دن پہلے ایک پُر فضا مقام کی سیر کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ ابھی ایک دن ہی ہوا تھا کہ آئی جی صاحب کی طرف سے طلبی

ہو گئی...... اور راستے میں فرزانہ کے کانوں نے پروگرام ہی بدل کر رکھ دیا۔

''آواز اس طرف سے آ رہی ہے۔'' فرزانہ نے اشارہ کیا۔ اس طرف کچے پکے بہت سے گھر نظر آ رہے تھے۔

''اس طرف سے آ رہی ہے تو اسی طرف جائیں گے۔'' فاروق نے کندھے اُچکائے۔

اب تینوں اس سمت میں چلے۔ گویا یہ آبادی سڑک کے کنارے ہی واقع تھی۔ آگے بڑھنے پر انھوں نے محسوس کیا، وہ کوئی صاف ستھرا اور ماڈرن سا قصبہ تھا، کیوں کہ زیادہ تر گھر اچھے اور خوب صورت تھے۔ کچے گھر بہت کم تھے۔

وہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ ابھی تو وہ ناشتا بھی نہیں کر سکے تھے۔ سورج بھی لحمہ لحمہ اوپر ہو رہا تھا۔ موسم حد درجے خوش گوار تھا، نہ گرمی تھی نہ سردی۔ اکتوبر کا موسم ایسا ہی ہوتا ہے۔

''تت...... تو کیا تمھیں اب بھی آواز آ رہی ہے فرزانہ؟'' محمود نے پوچھا۔

''بالکل آ رہی ہے۔''

''اللہ تعالیٰ نے تمھیں حیرت انگیز کان دیے ہیں۔''

''شکر ہے اس کا۔'' فرزانہ بھرپور انداز میں مسکرائی، پھر اس نے چونک کر کہا: ''آواز نزدیک آتی گئی۔ گویا ہم اس خاتون تک پہنچنے ہی والے ہیں، لیکن حیرت ہے۔''

''حیرت کس بات پر؟'' فاروق نے اس کی طرف دیکھا۔

''اس پر کہ قصبے کے لوگ، آس پاس کے لوگ اس کے دکھ کا علاج کیوں نہیں کر رہے۔

اس کی مدد کیوں نہیں کر رہے۔ ہم نے تو سنا ہے، قصبوں اور دیہاتوں کے لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں خوب شریک ہوتے ہیں۔''

''ہاں! یہ بات تو حیرت انگیز ہے۔ خیر معلوم ہو جاتا ہے۔''

جلد ہی انھوں نے جان لیا، آواز کس گھر سے آ رہی تھی۔ وہ ایک چھوٹا کچا گھر تھا، شاید ایک کمرے کا۔ کھلے دروازے سے صحن صاف نظر آ رہا تھا اور اس صحن میں ایک چھوٹی سی چارپائی پر لیٹی ایک بوڑھی عورت رو رہی تھی۔ تینوں دروازے کے باہر رک گئے۔

''السلام علیکم اماں!'' فاروق نے نرم اور محبت بھری آواز میں کہا۔

اچانک وہ چپ ہو گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی اور پھر اس نے چلاّنے کے انداز میں کہا: ''میرا بیٹا آ گیا...... میرا بیٹا آ گیا۔''

دوسرے ہی لمحے وہ چارپائی سے اُٹھی اور ننگے پیروں دروازے کی طرف بڑھی، پھر اس نے فاروق کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا: ''میرا بیٹا...... میرا بیٹا! تُو کہاں چلا گیا تھا؟ دیکھ میں رو رو کر پاگل ہو گئی ہوں۔''

پھر اس کی نظر فاروق کے چہرے پر پڑی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ کر فاروق کو دیکھا اور مایوسی سے بولی: ''نن...... نہیں...... تم میرے بیٹے نہیں ہو، لیکن آواز تو بالکل وہی تھی۔ لل...... لیکن تم ہو کون؟''

''اماں! ہم اِدھر سے گزر رہے تھے، آپ کے رونے کی آواز سنی تو اِدھر آ گئے۔ ہم معافی چاہتے ہیں۔'' محمود نے پُرسکون آواز منھ سے نکالی۔

''معافی! معافی کیسی بیٹے! ارے ہاں۔ تم بھی تو میرے حماد نہیں ہو اور نہ تم۔''

یہ کہتے ہی وہ واپس مڑی اور چارپائی پر بے دم سی ہو کر گر پڑی۔

وہ چند لمحے تک باہر ہی دروازے پر کھڑے ہو کر اسے دیکھتے رہے۔ آس پاس کوئی آتا جاتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید سب لوگ اپنے کھیتوں کا یا کام کاج کا رخ کر چکے تھے۔ قصبوں اور دیہاتوں کی عورتیں بھی کھیتوں میں کام کرتی ہیں، اسی لیے آس پاس سناٹا تھا۔

''کیا ہم اندر آ سکتے ہیں ماں جی!''

''ماں جی...... یہ ماں جی تو تم نے بالکل میرے حماد کی طرح کہا ہے۔ تم لوگ کون ہو؟ خیر، پہلے اندر آ جاؤ۔''

وہ اندر چلے آئے اور پھر اس کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئے، کیوں کہ وہاں بیٹھنے کی اور کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ سامنے ایک کمرا تھا اور بائیں طرف اینٹوں کا بنا ہوا چولھا، اس میں تو اب راکھ بھی نہیں تھی، نہ جانے کب سے اس میں آگ نہیں جلائی گئی تھی۔

''آپ کے بیٹے حماد کو کیا ہوا ماں جی! وہ کہاں چلے گئے؟ اپنی ماں کو چھوڑ کر بھی بھلا کوئی جاتا ہے۔'' فرزانہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ کہیں نہیں گیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر جا ہی نہیں سکتا۔ وہ مجھ سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ میرے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا، پھر بھلا وہ مجھے چھوڑ کر کیوں جاتا......! اسے تو کسی نے اغوا کیا ہے۔ سارے قصبے والے یہی بات کہتے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں؟''

''یہی کہ حماد اس طرح کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ تو ان سب کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ انتہائی محنتی تھا، بلکہ دوسروں کے حصے کا کام بھی کر دیتا تھا۔ اگر کسی کا کام ختم نہ

ہوا ہوتا اور وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا ہوتا تھا تو اس کا کام ختم کرنے میں فوراً مدد دیتا تھا۔ بہت ہنس مکھ، خوش رہنے والا، دوسروں کے ساتھ خوب گھل مل کر رہنے والا تھا۔ تم چاہو تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھ لو۔ سب یہی بتائیں گے۔"

"تو آپ کا خیال ہے، اسے کسی نے اغوا کیا ہے؟"

"یہ میرا خیال نہیں، یقین ہے۔"

"اور اس بات کو کتنے دن ہو گئے؟"

"کیا کہا، کتنے دن؟ دن نہیں، مہینے نہیں...... تین سال...... تین سال دو مہینے اور گیارہ دن ہو گئے ہیں۔"

"تین سال دو مہینے اور گیارہ دن؟" فرزانہ نے مارے حیرت کے کہا۔ اس کی آواز میں اب گہرا دکھ بھی شامل ہو گیا تھا۔

"ہاں......" اس نے کہا اور خلا میں تکنے لگی۔

"یہاں تھانہ یا پولیس چوکی ہے؟ آپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ رپورٹ درج کرانے کے بعد میں روز تھانے کے چکر لگاتی رہی۔ تھانے دار بس تسلیاں دیتا رہا، کیا اس نے کچھ بھی نہیں اس کا کہنا تھا کہ مائی بگو، وہ کوئی بچہ نہیں تھا کہ کوئی اسے اُٹھا نے لے جاتا۔ تیرا احماد تو بہت کڑیل نوجوان تھا، طاقتور، قد آور۔ اسے کون اغوا کر سکتا تھا۔ وہ تو اپنی مرضی سے تجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ آ جائے گا کسی دن تھک ہار کر۔ تُو فکر نہ کر۔ اب تم لوگ بتاؤ، ماں کو کیسے چین آ سکتا ہے؟ جب میں

چکر لگا کر تھک گئی تو جانا چھوڑ دیا۔ اب جب بھی حماد کا خیال آتا ہے، رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ روتے روتے تھک جاتی ہوں تو سو جاتی ہوں۔ پڑوسی دودھ دہی، روٹی اور سالن روزانہ دے دیتے ہیں۔ خاص طور پر فیروز کے گھر والے میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کھانے پینے کی اور دوسری ضروریات کی کوئی تنگی نہیں ہونے دیتے، لیکن میں کیا کروں...... ! حماد کے بغیر کیسے زندگی گزاروں۔ اب تو روتے روتے میری آنکھیں کم زور ہوگئی ہیں، لگتا ہے، حماد نہیں آئے گا۔''

''ناامید نہ ہوں ماں جی! اللہ تعالیٰ کو آپ پر رحم آگیا، اس نے آپ کی مدد کے لیے ہمیں بھیج دیا ہے۔ اب ہم آپ کے بیٹے کو تلاش کر کے رہیں گے۔''

''تت...... تم تلاش کرو گے؟ یہ...... یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟ تم تو خود کم عمر ہو۔''

''ہاں ماں جی! ہم کم عمر ضرور ہیں، لیکن بالکل بچے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم اللہ کی مہربانی سے عام بچے بھی نہیں ہیں۔''

''پھر تم کیسے بچے ہو؟'' اس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

''یہ ہم پھر بتائیں گے، پہلے تو ہم ذرا تھانے ہو آئیں۔ آپ کے پاس اس کی کوئی تصویر ہے تو دے دیں۔''

اس نے اندر رکھا ٹرنک کھولا اور تصویر نکال کر ان کی طرف بڑھا دی۔ انھوں نے دیکھا، وہ گبرو جوان تھا۔ ایک اُنگلی میں انگوٹھی بھی تھی، بہت خوب صورت انگوٹھی۔

''لیکن تھانے دار تو تم سے سیدھے منھ بات بھی نہیں کرے گا۔''

''ہمیں اُمید ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ آپ ہمارے لیے دعا کریں۔''

''میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو میرا بیٹا نہ مل جاتا......!''

''یہ تو خیر آپ کو نہیں کہنا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، کب دعا قبول کرتا ہے۔ اب یہ جو ہم یہاں تک آ گئے ہیں، یہ آپ کی دعائیں ہی تو ہمیں لائی ہیں۔ لہٰذا آپ بس دعا کریں۔''

''اچھا بچو!'' اس نے کہا اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔

وہ گھر سے نکل آئے۔ اب اِکا دُکا لوگ نظر آنے لگے تھے۔ انھوں نے ایک سے پوچھا۔

''بھائی صاحب! تھانہ کس طرف ہے؟''

''تھانہ؟۔'' اس نے چونک کر کہا۔

''جی تھانہ۔'' محمود مسکرایا۔

اس نے ایک نظر عجیب سی ان پر ڈالی، جیسے کہہ رہا ہو، یہاں تو آج تک کسی کو تھانے کا راستہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تم کیا کرو گے، تھانے کا راستہ پوچھ کر، پھر اس نے کہا: ''بائیں طرف سیدھا راستہ تھانے کو جاتا ہے۔''

''شکریہ! آپ مائی بگو کو جانتے ہیں؟''

''حماد کی ماں کو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں!'' محمود نے سر ہلایا۔

''ہاں، جانتا ہوں...... کیوں؟''

''حماد کے بارے میں لوگوں کا کیا خیال ہے۔''

''وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر خود سے جانے والا تو تھا نہیں۔ وہ تو ماں پر جان دیتا تھا۔ اس

لیے سب کا خیال یہی ہے کہ اسے کسی نے غائب کر دیا ہے یا جان سے مار کر کہیں دفن کر دیا ہے۔ قصبوں اور دیہاتوں میں ایسی وارداتیں ہو جاتی ہیں۔ یہاں کب پولیس چھان بین کرتی ہے۔''

''ہوں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا شکریہ۔''

''لیکن آپ حماد کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں، کیا اس کا کوئی سراغ ملا ہے آپ کو؟''

''ملا نہیں، ہم اس کی تلاش میں جا رہے ہیں۔''

''بہت مشکل ہے، تین سال ہو گئے ہیں۔ اب تو اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہوں گی۔ زیادہ تر خیال یہی ہے کہ حماد اب زندہ نہیں، لیکن یہ بات کہنے کی کوئی بھی جرأت نہیں کرتا۔ حماد کی ماں ایسا کہنے والے کی جان کو آ جاتی ہے۔''

''ہاں! ماں جو ہوئی۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ راستے میں ملنے والے لوگ انھیں حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگتے۔ وہ اپنا راستہ طے کرتے رہے، آخر تھانہ نظر آ گیا۔ تھانے کی عمارت پختہ اور سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ دروازے پر ایک کانسٹیبل بھی نظر آیا، لیکن وہ بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا تھا۔ وہ نزدیک پہنچے تو وہ انھیں گھورنے لگا۔ وہ اور آگے بڑھے، اس کے قریب پہنچے تو کانسٹبل کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے، بڑی بڑی اور خوف ناک مونچھیں بھی ساتھ میں حرکت کرتی نظر آئیں۔ آخر اس نے پھنکار کر کہا: ''کہاں چلے آ رہے ہو؟ نظر نہیں آتا، یہ تھانہ ہے۔''

''تب تو ہم بالکل درست جگہ آئے ہیں۔'' محمود مسکرایا۔

''اوہو، اچھا..... کیا کام ہے؟''

''تھانے دار صاحب کے بتانے کے لائق ہے۔''

''جاؤ، جاؤ..... اندر جا کر بتاؤ، لیکن میرا حصہ پہلے.....!''

''کیا مطلب؟''

''ارے بھئی، تم اسے داخلہ فیس کہہ لو۔''

''اوہ! اچھا..... تھانے میں داخلہ فیس کتنی ہے؟''

''بس پانچ سو روپے دے دو۔''

''چوں کہ یہ ہم واپس لے لیں گے، اس لیے دے دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر محمود نے پانچ سو روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایسے میں کانسٹیبل یہ دیکھ چکا تھا کہ اس کی جیب میں اور بھی ہزار اور پانچ سو روپے کے بہت سے نوٹ ہیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی، بول اُٹھا: ''اتنے نوٹ..... کہیں ڈاکا ڈالا ہے کیا؟''

''ارے نہیں، یہ خالص میرے اپنے ہیں۔ خالص میرے اپنے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے پاس اپنے اپنے ہیں۔''

''کیا! اس کا مطلب ہے، کوئی لمبا ہاتھ مارا ہے تم تینوں نے؟''

''بتایا نا، یہ ہمارے اپنے ہیں۔''

''اندر جاؤ، پتا چل جائے گا۔''

''کیا پتا چل جائے گا؟''

''یہی کہ یہ نوٹ تمھارے ہیں یا کہیں واردات کر کے حاصل کیے گئے ہیں۔''

''اچھی بات ہے، جب پتا چل جائے تو ہمیں بھی بتا دیجیے گا۔''

''تمھیں تو ایسا بتائیں گے کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔''

''اچھی بات ہے، دیکھا جائے گا۔ آؤ بھئی۔''

اور پھر وہ اندر کی طرف چل پڑے۔ پہلے ایک بہت کھلا صحن آیا۔ صحن کے سامنے تین کمرے تھے۔ تینوں پر چق ڈالی گئی تھی۔ ایک دروازے پر لکھا تھا: سب انسپکٹر عامی خان۔ وہ چق اُٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ تھانے دار صاحب کرسی کی پُشت پر سر رکھے گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔

انھوں نے کھنکار کر اسے جگانا چاہا، لیکن ان کی کھنکاروں سے جاگنے والا وہ کہاں تھا۔

''اے جناب!'' محمود نے ہانک لگائی۔ وہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔

''سنیے انسپکٹر صاحب!'' فاروق بولا: ''بلکہ اُٹھیے، جاگ جایئے۔ آپ کا سونے کا وقت پورا ہو چکا۔ اب آپ کے جاگنے کے دن آ گئے۔ اب آپ ایسے جاگیں گے کہ نیند آپ سے کوسوں دور بھاگ جائے گی۔''

کانسٹیبل ان کے عقب میں نمودار ہوا: ''اے بدتمیزو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ انسپکٹر صاحب کی شان میں گستاخی پر گستاخی......!''

ایسے میں سب انسپکٹر عامی خان کا جسم ایک جھٹکے سے ہلا، پھر اس نے آنکھیں کھول دیں، چلّا کر بولا: ''یہ شور کیسا ہے؟''

''سر! شور یہ لوگ کر رہے ہیں۔ میں انھیں سمجھا رہا تھا، لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''تو اب سمجھ جائیں گے۔''

''اور سر! ان کے پاس بڑے کرنسی نوٹ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ لگتا ہے، کہیں لمبا ہاتھ مار کر آئے ہیں۔''

''کیا!!!'' ارے تو ان کے ہاتھوں میں اب تک ہتھکڑیاں کیوں نہیں لگائی گئیں۔''

''آپ کی طرح یہ دوسروں کے بھی آرام کا وقت ہے نا سر!'' اس نے فوراً کہا۔

''اوہ...... جاؤ، جگاؤ انہیں۔''

وہ فوراً مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ اب انسپکٹر عامی خان ان کا جائزہ لینے لگا۔ کافی دیر تک گھورتے رہنے کے بعد بھی اس نے کچھ نہ کہا، بس گھورتا ہی رہا، یہاں تک کہ عملے کے تین آدمی اور اندر آ گئے۔ اب انھوں نے بھی ان تینوں کو گھورنا شروع کیا۔

''آخر گھورنے کا سلسلہ کب ختم ہوگا!''

''ہتھکڑیاں لگا دو انھیں۔''

''کس جرم میں؟'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''تم لمبی چوڑی واردات کر کے آ رہے ہو۔ غلام خان کی بات نہیں سنی تم نے...... یہ کہ تم لمبا چوڑا ہاتھ مار کر آ رہے ہو اور تمھارے پاس لوٹی ہوئی بڑی رقم بھی موجود ہے۔''

''اوہ اچھا یہ بات ہے، تو پھر پہلے تفصیل سن لو، بعد میں ہمیں گرفتار کر لینا۔ ہم بھاگے نہیں جا رہے۔ ہم سے بات چیت کرنے میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔''

''اچھا کہو، کیا بات ہے؟''

''تین سال پہلے حماد نامی ایک نوجوان قصبے سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کا آج تک

کوئی پتا نہیں چلا۔ اس کی ماں رو رو کر پاگل ہوگئی ہے۔ اس کی تلاش کے سلسلے میں تم لوگوں نے اب تک کیا کیا؟ اس کی فائل نکال کر لے آؤ اور تفصیل بھی سناؤ۔"

"ہائیں، ہائیں...... تم لوگوں نے سنا، یہ لڑکا کس طرح باتیں کر رہا ہے، جیسے یہ ہم پر افسر لگا ہوا ہے؟"

"ہاں سر! یہ تو بالکل ایسے انداز میں باتیں کر رہا ہے۔" ایک نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں، اس کو ابھی ہوش میں لے آتے ہیں۔"

"میں نے کہا ہے، حماد کی فائل نکلواؤ۔ اس وقت تم لوگوں کے سامنے دارالحکومت سے آئے محکمہ سراغ رسانی کے لوگ بیٹھے ہیں۔ زیادہ آئیں بائیں شائیں کی تو انجام اور بھیانک ہوگا۔"

"کیا کہا...... ! محکمہ سراغ رسانی کے لوگ......" عامی خان نے کہا اور قہقہے لگانے لگا۔ اس کے ساتھی بھی قہقہے لگانے لگے۔

وہ سب بُرے بُرے منھ بنانے لگے۔ محمود نے کہا: "اچھی بات ہے۔ خوب قہقہے لگالو، جب تھک جاؤ تو بتا دینا۔"

ان کے قہقہے ایک دم رک گئے، پھر عامی خان نے کہا: "تو تم محکمہ سراغ رسانی کے افراد ہو؟"

"تم نہیں! آپ...... تمیز سے بات کرو۔" محمود نے منھ بنایا۔

"اپنے کاغذات دکھاؤ۔" عامی خان نے جھلا کر کہا۔

"ہاں، اب بات کی ہے قاعدے کی۔" محمود نے کہا اور اپنے خصوصی کاغذات نکال

کر سامنے رکھ دیے۔

اب تو ان کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ بدن تھر تھر کانپنے لگے، آنکھوں میں خوف سما گیا۔ آخر عامی خان نے کہا: ''آپ...... آپ...... انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں؟''

''جی جناب!''

''مم...... معافی...... معافی چاہتے ہیں۔ آپ کو آتے ہی یہ کاغذات دکھا دینے چاہییں تھے۔''

''آپ نے یہ موقع دیا ہی کب...... آپ کو تو قہقہے لگانے سے فرصت نہیں تھی۔''

''ہم...... ہم سب معافی چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میں ابھی حماد کی فائل نکال کر لاتا ہوں۔ غلام خان! تم باہر ٹھیرو گیٹ پر...... عاقل میاں! آپ میرے ساتھ آئیں۔ بہادر علی! ان معزز مہمانوں کے پاس ٹھیرو۔'' اس نے ایک ہی سانس میں سب کو ہدایات دے ڈالیں اور پھر وہ عاقل خان کو ساتھ لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''کیا خیال ہے؟'' محمود نے سرسری انداز میں کہا، کیوں کہ ایک کانسٹیبل بہادر علی وہیں موجود تھا۔

''تیل دیکھتے ہیں، تیل کی دھار دیکھتے ہیں...... پھر جیسے کو تیسا۔''

''بالکل ٹھیک۔''

اچانک ایک سخت آواز گونجی: ''خبردار...... ! ہاتھ اوپر اُٹھا دو۔''

......☆......☆......

انھوں نے دیکھا، سب انسپکٹر عامی خان ان پر پستول تانے کھڑا تھا، جب کہ عاقل خان کے ہاتھ میں بندوق تھی اور اس کا رُخ بھی ان کی طرف تھا۔

''تم تینوں نے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ ہم فائر کریں گے، پھر نہ کہنا۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے...... پہلے تو اس بات کی وضاحت کر دیں؟''

''ہاتھ آئے شکار کو کیوں جانے دیں! تم تینوں کے پاس کافی نقدی ہے۔''

''بس! تم صرف اس نقدی کی وجہ سے ہمیں جان سے مارو گے، قتل کے مجرم بنو گے؟ کیا یہ بے وقوفی نہیں؟ آخر ہمارے والد صاحب یہاں پہنچ جائیں گے اور تم لوگ قانون کے شکنجے میں آجاؤ گے۔ پھر کیا فائدہ ہو گا اس بات کا۔ نقدی ہم تم لوگوں کو ویسے ہی دے دیتے ہیں۔ بس تم فائل نکال لاؤ۔''

''کیا مطلب؟ یعنی ہم نے اس وقت جو کچھ کیا؟ آپ لوگ اسے بھول جائیں گے؟'' عامی خان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں، تاکہ آپ لوگ جرائم سے توبہ کر لیں۔ ساری عمر کے لیے جیل نہ جائیں۔ ایسا ہم انسانیت کے ناطے کریں گے، کیوں کہ ابھی تک آپ نے سنگین جرم نہیں کیا، اگرچہ ارادہ کر چکے تھے، قتل کا ارادہ۔ یہ بھی کچھ کم خوف ناک نہیں۔ ہم آپ کے لیے کہہ رہے ہیں۔ آپ بہت برے پھنس جائیں گے۔ اب بھی وقت ہے، یہ پستول اور رائفل گرا دیں۔ حماد کی فائل نکال کر لے آئیں۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا اور سچے دل سے توبہ کر لی تو ہم اس بات کو نظر انداز کر دیں گے۔ ورنہ جیل تو آپ کے لیے تیار ہے ہی۔''

''لیکن آپ تین بچے ہی تو ہیں! ہمارے مقابلے میں آپ کر کیا لیں گے! ہم یہ سنہری

موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ ہم یہ داؤ ضرور کھیلیں گے، آر یا پار۔''

''آپ کی مرضی! اب تمام تر ذمّے داری آپ کے سر ہوگی۔ اب جو کرنا ہے، کرلو۔ خود کو بچا سکتے ہیں تو بچالیں۔''

''عاقل خان! نشانہ لے لو اور تینوں پر ایک ہی وقت گولی چلا دو، میں بھی تمھارے ساتھ ہی فائر کروں گا۔''

''اوکے سر۔'' عاقل خان نے کہا اور ان کا نشانہ لے لیا، اس کی اُنگلی ٹریگر پر جم گئی۔ عامی خان بھی اسی پوزیشن میں آچکا تھا۔ عین اس وقت دو فائر ہوئے۔ عامی خان کے ہاتھ سے پستول اور عاقل خان کے ہاتھوں سے رائفل نکل گئی۔ محمود اور فاروق کے ہاتھوں میں پستول تھے...... انھوں نے بجلی کی تیزی سے پستول نکال کر فائر کیے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ محمود اور فاروق اس طرح حرکت میں آئیں گے۔ ایسے میں انھوں نے فرزانہ کی چہکتی آواز سنی: ''اور ابھی تو میرے ہاتھ میں بھی پستول تھا، لیکن میں نے فائر نہیں کیا۔ میں موقعے اور محل کی منتظر تھی۔''

''اب تم ہاتھ اوپر اُٹھا دو...... فرزانہ! ان کا پستول اور رائفل اُٹھا لو، باقی دونوں بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور غلام خان! تم بھی......'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اندر کا منظر دیکھ کر غلام خان تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اگرچہ رائفل تھی، لیکن رائفل چلانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

جلد ہی انھوں نے سب کو رسیوں سے جکڑ دیا، پھر کچھ خیال آنے پر عاقل خان کے ہاتھ پیر کھول دیے۔

''تم حماد کی فائل نکال کر لے آؤ۔ فاروق! تم اس کے ساتھ جاؤ۔ اسے پوری طرح زد میں رکھنا۔''

''فکر نہ کرو۔'' فاروق مسکرایا۔

پستول کی زد پر رکھتے ہوئے فاروق اسے رکارڈ روم میں لے گیا۔ جلد ہی وہ فائل سمیت واپس لوٹے۔ فائل آتے ہی محمود نے سب انسپکٹر اکرام کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہاں محمود! کیا حال ہے! سنا ہے، تفریحی دورے سے واپسی ہے آج۔''

''واپسی میں ذرا بھنگ پڑ گئی۔'' محمود ہنسا۔

''ارے نہیں بھئی، وہ رنگ میں بھنگ ہوتی ہے۔'' اکرام ہنسا۔

''چلیے! پھر یونہی سہی انکل! پہلے حالات سن لیں۔ اس کے بعد حرکت میں آجائیں۔''

''اچھی بات ہے۔ تم کہتے ہو تو کر لیتا ہوں ایسا، ورنہ میں پہلے حرکت میں آنا پسند کرتا ہوں۔'' سب انسپکٹر اکرام مسکرایا۔

محمود نے تمام حالات سنا دیے۔ اس کے خاموش ہونے پر اکرام نے کہا: ''اس کا مطلب ہے، اس تھانے کا سارا عملہ ہی غلط کام کر رہا تھا۔ اچھا ہوا تم لوگ اس طرف آ گئے، ورنہ یہ لوگ بے چارے قصبے کے لوگوں کے ساتھ تو نہ جانے کیا کیا ناجائز کام کرتے ہوں گے، انھیں کس کس طرح لوٹتے ہوں گے۔ خیر، ہم ان سب سے اُگلوا لیں گے اور انھیں قرار واقعی سزا دلوائیں گے۔ جو انھوں نے کیا، اب ویسا ہی بھریں گے اور اب اس سلسلے میں فوری طور پر دارالحکومت سے نیا عملہ بھی لانا ہوگا۔ آخر کو یہ تھانہ ہے، خالی تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں سر جمشید سے بات کرتا ہوں۔ وہ آئی جی صاحب سے بات کریں گے اور

ان شاء اللہ آج ہی یہاں نیا عملہ آجائے گا اور اُمید ہے عوام سکھ کا سانس لیں گے۔ انھیں انصاف ملے گا، ظلم و ستم کا بازار بند ہوگا۔"

"واقعی انکل! اس لحاظ سے تو ہمارا یہاں آنا بہت بہتر رہا، لیکن ابھی ہمارا اصل کام باقی ہے اور وہ ہے حماد کا سراغ لگانا۔ آخر وہ کہاں ہے، زندہ ہے، یا کسی نے اسے مار دیا ہے۔ بہر حال جو بھی ہے، ہمیں اس معاملے کی تہ تک پہنچنا ہوگا۔ ابھی سب انسپکٹر عامی خان اور اس کے ماتحتوں کو فی الحال یہیں، یعنی انھی کے تھانے میں بند رکھا جائے گا، کیوں کہ حماد کے سلسلے میں کسی وقت بھی ان سے سوالات پوچھنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال یہ لوگ یہیں رہیں گے۔ نیا عملہ آنے تک یہ یہاں ٹھیریں گے، لیکن تم لوگوں کا اب کیا پروگرام ہے؟"

"فی الحال تو ہم کسی ہوٹل میں کمرا کرایے پر لے رہے ہیں۔ اب یہاں ٹھیرنا جو پڑ گیا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" اکرام مسکرایا۔

"جی، کیا کہا! کس کی ضرورت نہیں؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ اس قصبے میں ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ تم لوگ وہاں ٹھیرو۔ وہاں ملازم بھی ہے اور میرے ایک دو ماتحت بھی وہاں تم لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔ اس طرح تم آرام سے حماد والے معاملے کو دیکھ سکو گے۔ ویسے میرا خیال ہے، حماد کا سراغ انھی دنوں زیادہ آسانی سے لگ سکتا تھا، لیکن ان دنوں تو پولیس نے شاید کچھ بھی کرنے کی

کوشش نہیں کی تھی۔''

''ایسا ہی لگتا ہے، اسی لیے بے چارے کا کچھ پتا نہیں لگا۔ یہ بھی ان کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''خیر کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اِدھر بھیج دیا ہے۔ اب ہم ان شاء اللہ حماد کا سراغ لگا لیں گے۔''

''ان شاء اللہ!''

اکرام اپنے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ یہ لوگ حماد کی فائل کھول کر اس کا مطالعہ کرنے لگے۔ فائل کے مطالعے سے جو باتیں ان کے سامنے آئیں، وہ یہ تھیں:

حماد تین سال پہلے ۹- اپریل کو صبح سویرے کھیتوں میں کام کرنے گیا۔ ان دنوں وہ زمیندار احمد نواز خان کے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ قصبے کے زیادہ تر لوگوں کا ذریعہ معاش یہی تھا کہ سارا سال مختلف لوگوں کے کھیتوں میں کام کرتے رہتے تھے۔ اس طرح انھیں سارا سال ہی کام ملتا رہتا تھا۔ یہ سارا قصبہ ہی زرعی تھا۔ قصبے کے لوگ کبھی کسی زمیندار کے کھیتوں میں کام کرتے تو کبھی کسی کی زمینوں پر۔ حماد صبح کھیتوں پر گیا، شام کو معمول کے مطابق واپس آیا اور روزمرّہ کے کام کاج اور کھانے وغیرہ کے بعد سو گیا۔ دوسری صبح وہ گھر میں نہیں تھا۔ اس کا بستر خالی پڑا تھا۔ ماں نے اسے آوازیں دیں، لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے گھر سے باہر نکل کر آس پاس کے پڑوسیوں سے پوچھا۔

حماد کی ماں اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اس کا ایک معمول تھا۔ وہ صبح سو کر اُٹھتا تو گھر

کے کام کاج میں لگ جاتا۔ اپنی والدہ کو کم سے کم کام کرنے دیتا تھا۔ جو کام بھی وہ ماں کی مدد کے طور پر کرسکتا تھا، کرنے لگ جاتا تھا۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ کھیتوں پر کام کرنے چلا جاتا۔ بس یہ تھا اس کا معمول۔ بہر حال اس روز صبح سے شام ہو گئی، لیکن حماد کے بارے میں کچھ پتا نہ چلا۔ حماد کی والدہ تو صبح سے ہی بے چین تھی، لیکن شام ہوتے ہوتے تو آس پاس کے لوگ بھی گھبرا گئے اور حماد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ قصبے اور دیہات کے لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے ہیں، دکھ درد میں اور خوشی میں برابر شریک رہتے ہیں، اس لیے سب لوگ حماد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کھیت چھان مارے۔ گاؤں سے باہر بھی کافی دور تک دیکھ آئے، لیکن حماد تو اس طرح غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دوسرے دن تلاش کا دائرہ اور بڑا کر دیا گیا۔ لوگ موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں پر تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن ان کی ہر کوشش ہی بے کار گئی۔ اس طرح تلاش جاری رہی۔ لوگ تھانے بھی جاتے رہے، لیکن تھانے دار عامی خان بھی کوئی کام نہ دکھا سکا۔ اس طرح آہستہ آہستہ معاملہ پُرانا ہوتا گیا۔ مایوسی کے بادل گہرے ہوتے چلے گئے۔ لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ کسی نے اسے قتل کر دیا اور کہیں دفن کر دیا۔ ایک بس مائی بگّو تھی، جو یہ بات ماننے پر کسی صورت تیار نہیں تھی۔ اس کا بس ایک ہی جملہ تھا:

"میرا بیٹا زندہ ہے۔ وہ ایک دن ضرور لوٹ کر آئے گا۔"

تین سال ضرور گزر گئے، لیکن مائی بگّو کے آنسو ختم نہ ہو سکے۔ وہ بلا ناغہ دن میں اور رات میں کئی بار روتی، آس پاس کے لوگ اس کے رونے کی آواز سنتے۔ ان کی بھی

آنکھوں میں آنسو آ جاتے، لیکن وہ اس کے لیے کر کچھ نہیں سکتے تھے، وہ بالکل بے بس تھے۔

وہ فائل پڑھ کر فارغ ہوئے تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ چکے تھے اور وہ بُری طرح بے چین ہو رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے مائی بگو کی ساری بے چینی ان میں منتقل ہو گئی ہو۔ ان حالات میں محمود نے سب انسپکٹر اکرام کو فون کیا۔

''انکل! حسبِ عادت ہم ابھی اور اسی وقت اس کیس پر کام شروع کر رہے ہیں۔ اب ہم آرام نہیں کر سکتے۔''

اکرام نے کہا: ''اچھی بات ہے۔''

''بلکہ اس سے بھی پہلے انکل! ہم مائی بگو سے بات کریں گے، اس روز جب حماد کام سے واپس آیا تھا، اس کا مزاج کیسا تھا، وہ کسی سے لڑ بھڑ کر تو نہیں آیا تھا۔''

''ایسی کوئی بات ہوتی تو قصبے میں یہ بات اس کے غائب ہوتے ہی سامنے آ جاتی۔'' اکرام نے کہا۔

محمود نے کہا: ''پھر بھی انکل! بعض باتیں سامنے نہیں آ پاتیں، لیکن اندر کے لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں۔''

اکرام نے کہا: ''خیر، ٹھیک ہے۔ تم آغاز کرو۔ میں اِدھر کے کام مکمل کرتا ہوں۔ نیا عملہ آنے پر میں تو واپس چلا جاؤں گا اور تم رات کو کہاں ٹھیرو گے؟''

محمود نے کہا: ''وہیں ریسٹ ہاؤس میں۔''

''احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر یہ قتل کا کیس ہے تو قاتل کے کان کھڑے ہو چکے ہیں کہ تین سال بعد کچھ لوگ گڑے مردے اُکھاڑنے کے لیے آ چکے ہیں۔ یا اغوا کا کیس ہے،

تب بھی اغوا کرنے والا خبردار ہو چکا ہوگا، نہیں ہوا تو ہو جائے گا۔''

''ہوں...... اللہ مالک ہے۔ ہم احتیاط کریں گے۔ اب ہم چلتے ہیں۔''

وہ وہاں سے سیدھے مائی بگو کے گھر آئے۔

''کچھ ہوا، میرے بچو!''

''ماں جی! ہم نے کام شروع کر دیا ہے اور کام کی ابتدا آپ سے ہو رہی ہے۔''

''مجھ سے! کیا مطلب؟''

''جس رات حماد غائب ہوا، اس روز اس نے کھیتوں میں اپنا کام کیا تھا۔ پھر گھر آیا تھا اور اپنے سارے کام معمول کے مطابق کیے تھے۔ پھر سو گیا تھا اور دوسری صبح بستر پر نہیں ملا تھا۔ آپ یہ بتائیں، اس روز جب وہ کام سے واپس آیا تھا تو اس کا مزاج کیسا تھا، غصے میں تو نہیں لگتا تھا؟''

''مزاج...... غصے میں......؟'' مارے حیرت کے مائی بگو بول اُٹھی۔

''ہاں! سوچ کر بتائیں؟''

''بات دراصل یہ ہے بچو! وہ بہت خوش مزاج ہے۔ ہر وقت چہکتا، مسکراتا اور دوسروں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا اس کی عادت ہے، لیکن اس روز واقعی اب تم نے پوچھا ہے تو یاد آیا، وہ چپ چپ تھا، لیکن سچ تو یہی ہے کہ اس بات کا خیال تمھارے پوچھنے پر آیا ہے، ورنہ میں خود سے اس روز یہ بات محسوس نہیں کر سکی تھی۔''

''جب آپ نے محسوس ہی نہیں کیا تو یہ پوچھنے کا سوال ہی کب پیدا ہوا تھا کہ بیٹے! تم چپ چپ کیوں ہو۔''

''ہاں بالکل، جب میں نے محسوس ہی نہیں کیا تو پوچھ کیسے سکتی تھی۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب آپ بتائیں! یہ زمیندار نواز احمد خان کیسا آدمی ہے؟''

''اچھا آدمی ہے۔ اس کے خلاف کبھی کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔ کام کے پورے پیسے شام ہوتے ہی دے دیتا ہے۔''

''ہوں! حماد نے کبھی کوئی شکایت تو نہیں کی۔''

''نہیں!'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''اچھی بات ہے ماں جی!'' محمود نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اب کہاں چلے، ابھی تو آئے ہو؟''

''اب ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے، جب تک کہ آپ کے بیٹے کا سراغ نہیں لگا لیتے۔ اس وقت تو ہم احمد نواز خان سے ملنے جا رہے ہیں۔''

''اوہ! تو کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ حماد کی گمشدگی کا تعلق اس سے ہے۔''

''ماں جی! ابھی ہم کچھ بھی خیال نہیں کر رہے، بس آپ ہمارے لیے دعا کریں۔''

''میں تمھارے لیے دعا نہیں کروں گی تو کس کے لیے کروں گی۔ تم تو میری آخری اُمید ہو۔''

''کک...... کیا کہا آپ نے؟'' فاروق چونکا۔

''میں نے کہا ہے...... تم تو میری آخری اُمید ہو۔''

محمود نے جلدی سے فاروق کو گھورا، کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دے، کہ آخری اُمید تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔ اب اس بے چاری کی سمجھ میں یہ بات کیا خاک آتی۔ فاروق نے

بھی فوراً یہ بات بھانپ لی اور یہ جملہ نہ کہا۔

''اچھا ماں جی! ہم چلے۔''

''اللہ کام یاب کرے۔'' اس نے فوراً کہا۔

''آمین۔'' ان کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

اب وہ باہر کی طرف چلے۔ ایک گزرتے ہوئے شخص سے نواز احمد خان کے گھر کا راستہ پوچھا۔ اس نے فوراً راستہ بتا دیا۔ تینوں تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ صرف دس منٹ بعد وہ ایک بڑے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ انھوں نے دیکھا، وہ کوٹھی نما مکان تھا اور بہت لمبا چوڑا بھی تھا۔ اس کا دروازہ بھی بہت بڑا اور پرانی سیاہ لکڑی کا تھا۔ باہر کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں تھا۔ محمود نے آگے بڑھ کر دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ ایک بار نہیں، وقفے سے تین بار بجا دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور سخت لہجے میں کہا گیا: ''تین بار گھنٹی کیوں بجائی؟ کیا آپ کے خیال میں اندر سب بہرے بستے ہیں۔''

انھوں نے دیکھا، وہ بڑی بڑی خوف ناک مونچھوں والا شخص تھا اور دیہاتی لباس میں تھا۔

''اوہ معاف کیجیے گا، ہم ذرا غلط سمجھ گئے تھے۔ ہمیں محترم احمد نواز خان صاحب سے ملنا ہے؟''

''کیوں ملنا ہے؟'' اس کے لہجے میں اکھڑ پن تھا۔

''ان سے ضروری کام ہے۔''

''تم اس قصبے کے تو نہیں لگتے؟'' اس نے انھیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ہیں بھی نہیں۔''

''میں بتا دیتا ہوں۔اب معلوم نہیں، وہ ملنا پسند کرتے ہیں یا نہیں۔''

''اگر وہ ملنا پسند نہیں کریں گے تو پھر یہاں پولیس آئے گی اور وہ ہماری ان سے ملاقات کا بندوبست کرے گی۔''

''کیا کہا...... یہ کیا بات ہوئی؟''

''جو کہا ہے، وہی بات ہوئی۔ اندر جا کر بتا دیں۔ دارالحکومت سے تفتیشی ٹیم آئی ہے۔''

''تفتیشی ٹیم......'' اس نے انھیں تیز نظروں سے گھورا، پھر بولا: ''تم پاگل لگتے ہو۔ تم تو بچے ہو، تمھارا کسی محکمے میں سے کیا تعلق؟''

''تعلق ہے، تمھیں اس سے کیا مطلب؟ اگر تم نے اور دیر لگائی تو ہو سکتا ہے، خان صاحب تم پر بگڑیں۔''

''جا رہا ہوں، وہ مجھ پر نہیں، تم پر بگڑیں گے۔''

''کوئی پروا نہیں، ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ کوئی بگڑے یا سنورے۔''

اس نے انھیں تیز نظروں سے گھورا، پھر ایڑیوں پر گھوم گیا۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ تین منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ ''چلو، خان صاحب بلا رہے ہیں۔'' اس نے کافی نفرت کے انداز میں کہا۔

وہ مسکرا کر رہ گئے۔ ایسی باتوں پر وہ کبھی غصے میں نہیں آتے تھے، دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھتے تھے۔ ملازم انھیں ساتھ لے کر چلا۔ پہلے ایک بہت بڑا صحن عبور کرنا پڑا، پھر کہیں جا کر کمرے نظر آئے۔ ڈرائنگ روم میں انھیں بٹھا کر ملازم چلا گیا۔ جلد ہی وہ پھر اندر آیا۔

اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ اس میں لسی کا جگ اور تین گلاس تھے۔

''یہ آپ کیا کرنے لگے؟ آپ خان صاحب کو بھیجیں، ہم یہاں کچھ کھانے پینے نہیں آئے۔''

''لیکن بچو! یہ ہمارے ہاں کی روایت ہے۔ گھر آنے والوں کو لسی پانی کے بغیر نہیں جانے دیتے۔''

یہ بھاری بھر کم آواز سن کر وہ چونک گئے۔ اندر داخل ہونے والا شخص بہت لمبا چوڑا تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں باہر کو اُبلی ہوئی تھیں اور ان کی وجہ سے اس کا چہرہ خوف ناک لگتا تھا۔

''السلام علیکم! آپ ہیں احمد نواز خان؟''

''ہاں! لیکن یہ لسی تو آپ کو پینی پڑے گی۔''

''پہلے سن لیں، ہم دار الحکومت سے آئے ہیں۔ ہمارا تعلق پولیس سے ہے اور ہم حماد کے سلسلے میں آئے ہیں۔''

''حماد...... کون حماد۔'' اس نے حیران ہو کر کہا۔

وہ اس وقت اس کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے صاف محسوس کر لیا کہ وہ حماد کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے، پھر بھی انجان بن رہا ہے۔

''مائی بگو کا بیٹا، جو تین سال پہلے آپ کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے گھر سے غائب ہو گیا۔''

''اچھا وہ...... ہاں، میں اس کے بارے میں جانتا ہوں، لیکن آپ اس کے سلسلے میں

میرے پاس کیوں آئے ہیں؟''

''جس سے اس کا تعلق رہا ہے، اس سے تو ہمیں ملنا ہی ہوتا ہے۔ وہ آپ کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ اس روز اس نے تمام دن کام کیا۔ شام کو گھر واپس آیا تھا۔ گھر میں اس نے اپنے سب کام معمول کے مطابق کیے، البتہ اس روز وہ قدرے چپ چپ تھا۔ اس کا مطلب ہے، دن میں کوئی بات ہوئی تھی۔ وہ کیا بات تھی، ہمیں پتا لگانا ہوگا اور یہ ہمیں آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ اس روز کیا ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تھا؟''

''تم لوگوں کا دماغ درست نہیں۔ میں کھیتوں میں ان کام کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ ہاں، کبھی کبھار چکر لگانے کے لیے چلا بھی جاتا ہوں۔ اس روز حماد کے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ آیا ہوگا تو میرے کھیتوں سے باہر۔ ہوسکتا ہے، اس کا کسی سے جھگڑا ہوا ہو۔''

''مطلب یہ کہ آپ کی اس سے کوئی اَن بَن نہیں ہوئی، کوئی ناراضی والی بات نہیں ہوئی؟''

''بالکل نہیں۔''

''اچھا چودھری صاحب! ہم چلتے ہیں۔''

''تم لوگوں نے لسی نہیں پی؟'' اس نے انھیں گھورا۔

''بات یہ ہے چودھری صاحب! ہم لسی پیتے ہی نہیں، چائے پیتے ہیں، وہ بھی اپنے وقت پر۔ ہمارے چائے کے اوقات مقرر ہیں۔ ان اوقات کے بغیر ہم چائے بھی نہیں پیتے لٰہذا اللہ حافظ۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت غلام شاہ اندر داخل ہوا۔

''میرا ملازم تمھارے ساتھ جائے گا۔'' احمد نواز خان کا لہجہ نا خوش گوار تھا۔

ایسے میں فرزانہ کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ انھوں اس کے چہرے پر خوف دوڑ گیا۔

......☆......☆......

محمود اور فاروق نے یہ بات فوراً محسوس کرلی۔ انھوں نے اس کی طرف دیکھا اور پریشان ہوگئے، کیوں کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

''خیر تو ہے فرزانہ!''

وہ چونک اُٹھی، جیسے اسے آس پاس کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ محمود کے پکارنے پر ہوش میں آگئی۔

''میں...... الحمدللہ! ٹھیک ہوں۔''

''ان لوگوں کو دروازے تک چھوڑ آؤ۔ چوکس رہنا، یہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنے پائیں۔''

''ایسی ویسی حرکت سے کیا مراد چودھری صاحب!''

''پہلی بات یہ کہ میں چودھری نہیں کہلاتا، خان صاحب کہلاتا ہوں۔ دوسری بات تم لوگ کوئی نہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرسکتے ہو، اس لیے میں نے یہ بات احتیاطاً کہی ہے۔'' اس نے جلدی جلدی کہا۔

''اچھا کیا، کوئی پروا نہیں، ویسے آپ کے ملازم کا کیا نام ہے؟''

''غلام شاہ...... یہی نام ہے نا تمھارا غلام شاہ!'' احمد نواز خان یہ کہتے ہوئے ہنسا۔

''جی ہاں سر!'' اس نے دانت نکال دیے، پھر ان کی طرف مڑا: ''آیئے چلیں۔''

وہ اس کے ساتھ باہر نکل آئے اور صحن عبور کرنے لگے۔ محمود اور فاروق اس وقت شدید بے چین تھے۔ وہ جلد از جلد جان لینا چاہتے تھے کہ فرزانہ کو کس بات پر جھٹکا لگا تھا۔ وہ اچانک خوف زدہ کیوں ہو گئی تھی۔ آخر دروازے پر پہنچ کر غلام شاہ نے کہا: ''اچھا جی......''

''شکریہ جناب!'' محمود نے کہا اور غلام شاہ نے دروازہ بند کر دیا۔

''آؤ جلدی...... میں خوف محسوس کر رہی ہوں۔''

''اللہ اپنا رحم فرمائے۔ ہوا کیا ہے؟''

''تم آؤ تو۔''

اس نے کہا اور تیز چلتے ہوئے ان سے آگے نکل گئی۔ انھیں بھی رفتار بڑھانی پڑی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''پہلے ہمیں مائی بگو کے گھر جانا ہے۔ پھر انھیں ساتھ لے کر تھانے جائیں گے۔ میں خوف محسوس کر رہی ہوں۔ شاید خطرات ہماری طرف منھ کھولے بڑھ رہے ہیں اور ہم ان کی لپیٹ میں آسکتے ہیں، لیکن اس سے پہلے کہ ہم خطرات کی لپیٹ میں آئیں، ہمیں مائی بگو سے ملاقات کرنی ہے اور انھیں تھانے لے جانا ہے، تا کہ ان کی حفاظت کا انتظام کر سکیں۔''

''اچھی بات ہے، رفتار تیز کر دو، لیکن یہ تو بتا دو، تم چونکی کیوں تھیں؟''

''غلام شاہ جب ہمیں باہر ملا تھا، یعنی جب ہم نے گھنٹی بجائی تھی اور اس نے دروازہ

کھولا تھا، اس وقت ......'' فرزانہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

'' آس پاس کوئی نہیں ہے جو تمھاری باتیں سن لے گا۔ کہہ ڈالو۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔'' محمود جل گیا۔

'' غلام شاہ جب پہلی بار ہمیں نظر آیا، اس کی بائیں ہاتھ کی اُنگلی میں ایک انگوٹھی تھی، لیکن بعد میں جب وہ کچھ دیر پہلے ڈرائنگ روم میں نظر آیا، وہ انگوٹھی اس کی اُنگلی میں نہیں تھی۔''

'' لیکن اس میں عجیب بات کیا ہوگئی! بھئی، نکال دی ہوگی اس نے۔'' فاروق نے بُرا سا منھ بنایا۔

'' لیکن کیوں نکال دی ہوگی؟''

'' بس ہم وہ وجہ جاننا چاہتے ہیں، کیوں کہ ویسی ہی انگوٹھی حماد نے بھی پہن رکھی ہے۔'' فرزانہ مسکرائی۔

'' اوہ......اوہ......'' ان دونوں کے منھ سے نکلا۔

آخر وہ مائی بگو کے گھر پہنچ گئے۔ وہ اندر موجود تھی۔ اسے دیکھ کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

'' ماں جی! آپ کو ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ آپ بس کھڑی ہو جائیں۔ ہم خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔''

'' خطرہ!'' مارے گھبراہٹ کے اس نے کہا۔

'' جی ہاں! خطرہ...... آیئے، چلیں۔''

''چلو بیٹا!''

وہ اسے ساتھ لے کر تھانے کی طرف روانہ ہوئے۔ نہ جانے کیوں ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ اصل میں یہاں اُن کے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی اور غلطی ان سے یہ ہوئی تھی کہ سب انسپکٹر اکرام کو فون کر کے گاڑی کے لیے نہیں کہا تھا۔

تیز تیز چلتے وہ خیریت سے تھانے پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی کہ تھانے میں بھی ہر طرح خیریت تھی۔ اکرام اور اس کے ماتحت وہاں موجود تھے۔ اب سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا رہا بھئی،'' اکرام نے بے تابی کے عالم میں کہا۔

''انکل! لگتا ہے، ہم درست سمت میں جا رہے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ہم خطرہ بھی محسوس کر رہے ہیں!''

''کیا یہاں پہنچ کر بھی خطرہ بدستور محسوس کر رہے ہو؟'' اکرام نے پوچھا۔

''ہاں انکل! یہاں پہنچ کر بھی...... اور ہم پہلی فرصت میں ماں جی سے ایک ضروری بات پوچھ لینا چاہتے ہیں۔''

''تو پوچھ لو، انتظار کس بات کا ہے؟''

''ماں جی! کیا آپ کے بیٹے حماد......''

عین اس لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے بم پھٹا ہو اور پھر ان سب کے ذہن تاریکی میں ڈوب گئے۔

......☆......☆......

انھیں ہوش آیا تو اکرام اور ان کے ماتحتوں سمیت وہ سب رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور کسی تہ خانے میں تھے۔ ان کے سروں پر رائفلیں لیے عامی خان، غلام خان اور عاقل خان کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں تھیں۔

''تو ہوش آ گیا تمھیں۔''

ہاں! اللہ کی مہربانی سے، لیکن یہ سب چکر کیا ہے؟۔''

''چکر...... ہاں، چکر کی وضاحت تو خیر ہم کریں گے۔ تمھیں موت کے گھاٹ اُتارنے سے پہلے تمھیں حماد کی کہانی سنائیں گے۔ اسی کی تلاش میں نکلے تھے نا تم لوگ! اور خود بھی پھنس گئے۔''

''حماد...... کہاں ہے حماد؟'' مائی بگو چلائی۔

''فکر نہ کرو، تمھیں اس کے ساتھ ہی آخرت کے سفر پر بھیج رہے ہیں۔''

''تت...... تو میرا احماد زندہ ہے...... آپ نے سنا، میرا احماد زندہ ہے...... میں نے کہا تھا نا، میرا دل کہتا ہے، حماد زندہ ہے۔'' مائی بگو بے تابانہ انداز میں کہتی چلی گئی۔

''لیکن اب کیا فائدہ...... اب تو تمھیں خود بھی اس کے ساتھ مرنا پڑے گا۔''

''ان لوگوں کی دخل اندازی کی وجہ سے تمھیں یہ دن دیکھنا پڑا...... ورنہ تم رو دھو لیتی تھیں، ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کہاں ہے میرا احماد؟''

''گھبراؤ نہیں، آ جاتا ابھی، مل لینا اس سے۔ پہلے باس کو آ لینے دو۔''

''باس...... کیا مطلب؟'' وہ سب چونکے۔

اس کے چہرے پر غرور ہی غرور تھا۔

"یہ لوگ حماد کو تلاش کرنے نکلے تھے۔ اب خود بھی پھنس گئے ہیں۔ بڑے بنے پھرتے ہیں جاسوس۔ چلے آئے دارالحکومت سے۔ ہے کوئی تک! اپنا اپنا کام کرو، خوش رہو، دوسروں کے کام میں کیوں ٹانگ اُڑاتے ہو۔ جس طرح حماد پھنس گیا، اسی طرح یہ بھی پھنس گئے۔" احمد نواز خان فخر اور غرور کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

"وہ کیسے پھنس گیا؟" محمود نے جلدی سے کہا، کیوں کہ یہ بات جاننے کے لیے وہ بہت بے چین تھے۔

"اس کی قسمت خراب تھی۔ ہم سے کچھ کہنے کے لیے کھیتوں سے میرے گھر چلا آیا۔ میرا بڑا بیٹا کہیں دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گیا تھا۔ اس نے پوچھا نہیں نہ دستک دی، بس اجڈوں کی طرح اندر چلا آیا۔ اِدھر میں عامی خان سے لوٹ مار کی وارداتوں کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ ہمیں اس کے اندر تک آجانے کا پتا ہی نہ چلا۔ ہم اس وقت برآمدے میں بیٹھے تھے، لیکن ہمارے منھ دروازے کی طرف نہیں تھے۔ وہ نزدیک آگیا اور ہماری بہت سی باتیں اس نے سن لیں۔ اس نے جان لیا کہ ہم لوگ لوٹ مار کا کام کرتے ہیں، یعنی پورا تھانہ میرے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ خاموشی سے واپس لوٹ گیا، لیکن باہر جاتے وقت اسے عامی خان نے دیکھ لیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ حماد نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ باتیں نہ سنی ہوتیں تو وہ اپنی بات کرتا، لیکن اس کے خاموشی سے لوٹ جانے کا مطلب یہی تھا کہ اس نے باتیں سن لی ہیں۔ اب ہم پریشان ہو گئے، کیوں کہ حماد کے

ذریعے یہ باتیں سارے قصبے میں پھیل سکتی تھیں۔ اسی وقت ہم نے اسے اُٹھانے کا پروگرام بنالیا اور رات کے وقت اسے اُٹھالائے۔ میں تو اسے قتل کرنا چاہتا تھا، لیکن یہ ہے ناعامی ...... یہ قتل کے حق میں نہیں تھا، اس لیے اسے مکان کے تہ خانے میں قید کر دیا۔ بس دو وقت روٹی دے دیتے تھے...... اور پانی۔''

''وہ ہے کہاں......؟''

''ابھی ملوا دیتے ہیں۔'' احمد نواز خان ہنسا، پھر اپنے ساتھیوں سے بولا: ''جاؤ، اس گنوار کو لے آؤ۔ کم بخت تین سالوں میں ذرا بھی نہیں بدلا۔ اسی طرح ہے، جیسا پہلے تھا۔''

''مم...... میرا فرماں بردار بیٹا جو ہوا۔'' مائی بگّو کے منھ سے نکل گیا۔

ان میں سے دو تہ خانے کے ایک تاریک گوشے میں چلے گئے۔ جلد ہی وہ حماد کو دونوں طرف بازوؤں سے پکڑ کر لاتے نظر آئے۔ اس وقت انھوں نے حما کو دیکھا۔ وہ بہت لمبا چوڑا اور خوب صورت جوان تھا۔ پھر جونہی اس کی نظر اپنی ماں پر پڑی، وہ پوری قوت سے چلاّ اُٹھا: ''ماں!''

ساتھ ہی اس نے ان دونوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس طرح اس کے ہاتھ چھوٹ گئے اور وہ اپنی ماں کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ جو اسے پکڑ کر لا رہے تھے، اس کی طرف دوڑے، لیکن نواز خان نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک لیا۔

''مل لینے دو بھئی، اسے اپنی ماں سے، ہمارا کیا جاتا ہے۔''

حماد اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ دونوں رونے لگے۔ ان کے رونے کی آوازوں سے تہ خانہ گونجنے لگا۔

”میرا بیٹا...... میرا بچہ......!“

”میری ماں...... ماں......!“

”اب بس کرو، بہت مل لیے۔ ہمیں اپنا کام بھی کرنا ہے۔ عامی خان! اب تو انھیں ٹھکانے لگانا ہوگا۔ ایک گہرے گڑھے میں ان سب کو دبانا ہوگا، کیوں کہ یہ لوگ آخر دارالحکومت کے ہیں۔ ان کی تلاش میں ان کے بڑے تو آئیں گے۔ سنا ہے، ان کے بڑے کا نام انسپکٹر جمشید ہے۔ بہت نامی گرامی آدمی ہے۔ وہ یہاں آکر بہت ہل چل مچائے گا۔ لہٰذا ہمیں ان کے دبانے کا کوئی سراغ نہیں چھوڑنا چاہیے ورنہ ہم سب بھی مارے جائیں گے۔ غلام شاہ جیسی کوئی غلطی اگر ہم نے کی تو پھر ہم گئے کام سے۔“

اس کے ایک ساتھی نے پوچھا: ”کیا مطلب باس! آپ کے غلام شاہ سے کیا غلطی ہوئی؟“

”اس کم بخت کو میں نے پہلے دن ہی منع کیا تھا کہ حماد کی کوئی چیز استعمال نہ کرو، کوئی پہچان نہ لے، پھر بھی اس نے اس کی انگوٹھی اُتار کر خود پہن لی۔ اب جب یہ لوگ مجھ سے ملنے آئے تو وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے جو اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا تو یہ گھبرا کر کمرے سے باہر گیا اور انگوٹھی اُنگلی سے نکال دی۔ اب جب یہ واپس کمرے میں آیا تو یہ لوگ اس کی اُنگلی میں انگوٹھی نہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ خاص طور پر یہ چالاک لڑکی تو چونک اُٹھی۔ میں نے اسے چونکتے دیکھ لیا اور اسی وقت میں نے سمجھ لیا کہ کام خراب ہوگیا۔ اب یہ لوگ پولیس کی بھاری نفری لے کر آئیں گے اور میرا گھر چھان ماریں گے۔ تہ خانہ تلاش کر لینا بھی ان کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ بس اسی وقت آناً فاناً مجھے ان پر وار کرنے کا پروگرام بنانا پڑا اور شکر ہے، یہ ابھی سنبھل

نہیں پائے تھے کہ ہم نے انھیں جالیا۔ اب فکر ہے تو اس بات کی کہ ان کے بڑے آئیں گے، ان سے کیسے نبٹا جائے۔"

"اس کی ترکیب میں بتا دیتا ہوں۔"

محمود کی آواز تہ خانے میں گونج اُٹھی۔ وہ چونک کر اس کی طرف مڑے۔ نواز خان نے ہنس کر کہا: "لو! اپنے بڑوں سے نبٹنے کی ترکیب بھی خود ہی بتا رہا ہے۔ اس سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔"

"تم!" فاروق مسکرایا۔

"کیا!!!" وہ چیخا۔

"ہاں، تم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا، جو اتنا بھی نہیں جانتا، جرم چھپا نہیں رہتا۔ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کر رہتا ہے اور ایک نہ ایک دن انسان جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے، جیسا کہ تم ہوگے۔ اب ترکیب سنو، تم خود کو قانون کے حوالے کر دو، ہمیں کھول دو۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔"

"سنا تم نے...... یہ لوگ نہ جانے خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ حال آنکہ ہم نے ان پر نہایت آسانی سے قابو پالیا ہے۔"

"اس کی وجہ ہے۔ ہم تم لوگوں کو سیدھے سادے بے وقوف قسم کے مجرم خیال کر بیٹھے تھے۔ اس بات کا تو ہمیں گمان بھی نہیں تھا کہ تم بھی تجربے کار مجرم ہو سکتے ہو اور تمھارے پاس بھی دھماکا خیز مواد ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ ہماری بے وقوفی تھی، دشمن کیسا ہی ہو، اسے کم زور اور بے وقوف نہیں خیال کرنا چاہیے۔ اب تو ہو گئی غلطی۔"

''عامی خان! کیا خیال ہے؟ اب ہمیں ان لوگوں سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔''

''میں ایک بار پھر کہتا ہوں باس! ہمیں قتل جیسے بھیانک جرم سے بچنا چاہیے، ورنہ ہم ان لوگوں کے بڑوں سے بچ نہیں سکیں گے، لہٰذا انھیں بندھا چھوڑ کر یہاں سے بھاگ نکلتے ہیں۔ ابھی ہمارے پاس بھاگنے کے لیے بہت وقت ہے۔ ہم یہاں سے دور بہت دور پہنچ جائیں گے۔''

''باس! انسپکٹر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ قتل زیادہ خوف ناک جرم ہے۔ اگر پکڑے گئے تو سزا ہو جائے گی۔ اس جرم میں تو عام طور پر پھانسی یا عمر قید ہوتی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ یہ تو پہلے ہی بندھے ہوئے ہیں۔ بس حماد کو باندھ دیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تب پھر غلام شاہ! جلدی کرو۔''

انھوں نے حماد کو جکڑ دیا۔

''آؤ چلیں، اب ان کی قسمت، کیسے یہاں سے نکل پاتے ہیں، یا یہیں مر، کھپ جاتے ہیں۔'' عامی خان نے کہا۔

''ہمارا مقصد تو دولت سے ہے باس! وہ ہم سمیٹ لے جا رہے ہیں! صبح کا سورج نکلنے سے پہلے ہم نہ جانے کہاں کے کہاں پہنچ چکے ہوں۔''

وہ منھ سے کچھ نہ بولے۔ انھیں جاتا دیکھتے رہے۔

''اب ہماری باری ہے۔'' محمود کی آواز سنائی دی۔

ان سب نے چونک کر محمود کی طرف دیکھا۔

حماد کی ماں نے کہا: ''کیا مطلب بیٹے! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ہم ابھی ان رسیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔ یہ ہمارا روز کا کام ہے۔ چلو فاروق! میری کلائی پر بندھی رسی پر اپنے تیز دانت آزماؤ۔''

فاروق نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی محمود کے ہاتھ کھل گئے۔ اب اس نے اپنے جوتے کی ایڑی سرکائی اور اس میں سے ننھا سا چاقو نکالا۔

''ارے اتنا ننھا سا چاقو، وہ بھی جوتے کی ایڑی میں!'' مارے حیرت کے حماد کے منھ سے نکلا۔

''جی ہاں! ایسے حالات میں یہ ہمارا بہترین ہتھیار ہے۔''

محمود نے کہا اور چاقو سے ان سب کی رسیاں کاٹ دیں۔

''انکل! آپ حماد اور ان کی والدہ کو محفوظ مقام پر پہنچا دیں۔ دارالحکومت سے فوراً فورس منگوا لیں، تاکہ ہم بغیر کسی خون خرابے کے ان سب کو گرفتار کر سکیں، ورنہ یہ لوگ گرفتاری سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں بہت ماریں گے، ہر ممکن حد تک جان لڑائیں گے۔''

''ٹھیک ہے محمود میاں!''

سب انسپکٹر اکرام، انسپکٹر جمشید کو فون پر حالات بتانے لگا۔ باقی سب وہاں سے چھپتے چھپاتے نکلنے لگے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ آگے تھے، باقی لوگ پیچھے۔ اب ظاہر ہے، یہ تہ خانہ نواز خان کے گھر کا تہ خانہ تھا، جب وہ اس سے نکل کر اوپر آتے تو گھر میں ہی آتے

اور وہاں نواز خان اور عامی خان سے ملاقات ہو سکتی تھی، لیکن ملاقات سے پہلے وہ حماد اور اس کی والدہ کو محفوظ مقام پر پہنچا دینا چاہتے تھے اور انھوں نے یہی کیا۔ اوپر آکر اکرام نے اپنے چار ماتحتوں کا اشارہ کیا۔ وہ ان دونوں کو لے کر نکل گئے۔ اب انھوں نے گھر سے باہر نکل کر چاروں طرف پوزیشن لے لی۔ گھر میں روشنی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ ابھی اندر ہی ہیں۔ فرار ہونے میں کچھ تو وقت لگنا ہی تھا۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ گھر کے دروازے سے باہر نکلے۔ ان میں ہر کسی کے ہاتھ میں نہ پستول یا رائفل نہیں تھی۔ انھوں نے بھاری بھر کم بیگ ہاتھوں میں اُٹھا رکھے تھے۔ گویا وہ ان کی طرف سے بالکل بے فکر تھے اور اس خیال میں تھے کہ وہ اس قدر جلد تہ خانے سے باہر آ ہی نہیں سکتے۔ جب وہ سب ان کی زد پر آگئے تو محمود نے بلند آواز میں کہا: ”خبر دار! تم لوگ اس وقت پوری طرح ہماری زد میں ہو۔ سامان نیچے گرا دو اور ہاتھ اوپر اُٹھا دو۔“

وہ بُری طرح اُچھلے، ان کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ چہروں پر بے تحاشا دہشت دیکھنے میں آئی۔ ان سب کے ہاتھوں سے سامان چھوٹ کر گر گیا اور ان کے ہاتھ اوپر اُٹھ گئے۔

”اب اس سامان سے دس قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔“ اکرام بولا۔

انھوں نے اس پر بھی عمل کیا۔

”کیوں نواز خان اور انسپکٹر عامی خان! کیسی رہی؟“

انسپکٹر عامی نے کہا: ”تم حیرت انگیز لوگ ہو۔ کیوں نہ ہم اندر بیٹھ کر بات کرلیں۔ تم

لوگ ضرور کچھ سوال کرو گے، تو ہم جواب دیں گے۔ ہم کچھ اور بھی کام کی باتیں بتائیں گے، اگر تم لوگ سننا پسند کرو!''

''ہم سن لیں گے، لیکن ایک خیال رہے!'' محمود نے منھ بنایا۔

''وہ کیا؟''

''ہم سے کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' فاروق مسکرایا۔

''ٹھیک ہے، اس کا خیال رکھیں گے۔''

اب وہ سب اندر آ گئے۔ نواز خان انھیں اس کمرے میں لے آیا، جس میں پہلے بھی وہ اس سے ملاقات کر چکے تھے۔ جب سب اطمینان سے بیٹھ گئے، تب نواز خان نے کہا: ''ایک تجویز ہے، اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور ہمارا بھی!''

''کیا مطلب؟'' تینوں نے چونک کر ایک ساتھ کہا۔

''ان بیگوں میں بے شمار دولت ہے۔ ہم لوگ نہ جانے کب سے یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ ساری دولت خاموشی سے تم لوگ لے لو۔ بس ہمیں جیل نہ بھیجو، معاملہ یہیں ختم کر دو۔ معاملہ عدالت میں گیا تو یہ دولت تو پھر سرکاری خزانے میں جمع ہو گی۔ نہ تمھارے ہاتھ کچھ آئے گا، نہ ہمارے، لیکن ہماری تجویز کے مطابق آپ لوگ اس ساری دولت کے مالک بن جائیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔''

''یعنی تم رشوت میں یہ ساری دولت ہمیں دینا چاہتے ہو؟''

''ہاں بالکل۔''

''اس میں ایک مشکل ہے یہ کہ ہم نے یہ کام زندگی میں کبھی کیا ہی نہیں۔''

''تو اب کر لیں!''

''یہ کام ہمیں کسی نے سکھایا ہی نہیں، نہ ہم نے خود سیکھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے کیسے کر لیں؟''

''یہ بہت آسان کام ہے، بہت آسان ہے۔''

''یہ آسان ترین کام بھی ہمارے لیے مشکل ترین ہے، بلکہ ناممکن ہے۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، حلال روزی ہی کمائی ہے۔ حرام روزی کے تو نزدیک بھی نہیں لگے۔ لہٰذا تمھاری پیش کش کو ہم تمھارے منھ پر مارتے ہیں اور تم پُر سکون انداز میں جیل جاؤ۔ جیل تو اب تمھیں جانا ہوگا، لیکن یہ تو بتاؤ، تمھارا گٹھ جوڑ کیسے ہوا؟''

''عامی خان اور اس کے ماتحت یہاں نئے نئے لگے تھے۔ انھی دنوں میں نے ایک واردات کی تو جناب، جن کے ہاں واردات کی تھی، انھوں نے مجھ پر شک ظاہر کر دیا۔ عامی خان پوچھ گچھ کے لیے میرے پاس آیا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ رشوت کھانے والا ہے، لہٰذا اسے بڑی رقم کی پیش کش کر دی۔ اس نے خوشی سے رقم قبول کر لی۔ اس کے بعد ہم دوست بن گئے اور مل جل کر یہ کام کرنے لگے۔ اب جب پولیس ہی وارداتیں کرنے والوں کی ساتھی بن جائے تو پھر ڈر کیسا...... !بس حماد تو بلا وجہ ہمارے درمیان میں آ گیا، ورنہ یہاں تو کسی کو کانوں کان پتا نہیں تھا کہ ہم یہ کام کرتے ہیں۔''

''ہوں......تو تم ہمیں بھی عامی خان سمجھ رہے ہو؟''

''نہیں، تم لوگوں کے چہروں سے صاف ظاہر ہے کہ تم نے زندگی میں کبھی رشوت نہیں لی، نہ لوٹ مار کی ہے۔'' اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

''بس تو پھر ہم یہ کام کریں گے بھی نہیں تم جتنا جی چاہے زور لگا لو، لہٰذا جیل تو اب تمھیں جانا ہوگا۔''

اکرام کے ماتحت انھیں لے جانے کے لیے پہلے ہی تیار کھڑے تھے۔ان کے اشارے پر حرکت میں آگئے۔

''اب...... اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' محمود نے ان سے کہا۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے! بس دارالحکومت چلتے ہیں۔امی جان ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ان کی بھی دو چار سننی پڑیں گی، لیکن اس سے پہلے ہم مائی بگّو سے ملاقات کریں گے۔''

''اوہ ہاں، یہ بہت ضروری ہے، ورنہ انھیں شکایت ہوگی، ہم ملے بغیر ہی چلے گئے۔''

''بس تو پھر چلتے ہیں۔''

جلد ہی وہ مائی بگّو کے دروازے پر دستک دے رہے تھے، پھر جونہی دروازہ کھلا مائی بگّو مارے خوشی کے چلّائی: ''آگئے، فرشتے آگئے۔ آجائیں، اندر آجائیں۔ میں تم لوگوں ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے تمھارے لیے کھانے کی طرح طرح کی چیزیں تیار کی ہیں۔ میں کہتی تھی، تم جانے سے پہلے مجھ سے اور حماد سے ملنے ضرور آؤ گے۔ کیوں حماد!''

''ہاں ہاں! جی۔''

''آپ نے کیا کہا ماں جی! فرشتے...... لیکن ہم تو انسان ہیں۔''

''میرے اور حماد کے لیے تو فرشتے ہی ثابت ہوئے ہو۔

''تم جو بھی ہو، بہت عظیم ہو۔ دوسروں کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگا دینے والے، اپنا وقت اور اپنی ہر چیز قربان کر دینے والے، اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دینے والے......''

''بس ماں جی! بس، ورنہ ہم مارے گھبراہٹ کے یہاں سے دوڑ لگا جائیں گے۔'' محمود نے واقعی گھبرا کر کہا۔

''ارے نہیں، یہ کھانے کون کھائے گا۔ میں نے ساگ پکایا ہے، قیمہ کریلے اور مونگ کی دال تیار کی ہے، اندر آ جاؤ۔''

وہ دونوں انھیں کھینچ کر اندر لے آئے۔ اندر واقعی کھانا تیار تھا۔ اب جو انھوں نے وہ کھانے کھائے تو انھیں مزہ ہی آ گیا۔ ان میں اس قدر مرچیں تھیں کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''یہ، یہ کیا......! تم تو رونے لگے، میرے بچے؟''

''یہ...... یہ تو خوشی کے آنسو ہیں ماں جی!'' فاروق نے بہت مشکل سے کہا۔

''ویسے ماں جی! کھانا ہے واقعی بہت مزے کا۔''

''سچ۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں، بالکل سچ۔ اصل مزے تو ان ہی کھانوں میں ہوتے ہیں، جو خلوص سے تیار کیے جائیں۔''

''جیتے رہو میرے بچو! ہم اپنی زندگی کے آخری سانس تک تمھیں بھلا نہیں

پائیں گے۔''

پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، حماد، محمود اور فاروق سے گرم جوشی سے ملا اور فرزانہ کو مائی بگّو نے سینے سے لگا کر رخصت کیا۔ وہ دروازے پر کھڑے ہو کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے رہے، یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

جونہی انھوں نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی، ان کی والدہ کی چہکتی آواز نے ان کا استقبال کیا: ''دیکھیے، آ گئے میرے سپوت! انھیں تو ہر قدم پر کیس مل جاتے ہیں اور گھر میں کھانے ٹھنڈے ہوتے رہتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''وہی جو آپ کا خیال ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا۔

دروازہ کھلنے پر وہ اندر داخل ہوئے تو گھر کا صحن مزے مزے کے کھانوں کی خوش بو سے مہک رہا تھا اور بیگم جمشید انھیں دیکھ دیکھ کر بُرے بُرے منھ بنا رہی تھیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کے اس انداز سے بھی محبت ہی محبت ٹپک رہی تھی۔ ☆

تحریر بھیجنے والے نونہال یاد رکھیں

☆ اپنی کہانی یا مضمون صاف صاف لکھیں اور اس کے پہلے صفحے پر اپنا نام اور اپنے شہر یا گاؤں کا نام بھی صاف لکھیں۔ تحریر کے آخر میں اپنا نام پورا پتا اور فون نمبر بھی لکھیں۔ تحریر کے ہر صفحے پر نمبر بھی ضرور لکھا کریں۔

☆ بہت سے نونہال معلومات افزا اور بلاعنوان کہانی کے کوپن ایک ہی صفحے پر چپکا دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا ایک کوپن ضائع ہو جاتا ہے۔

☆ معلومات افزا کے صرف جوابات لکھا کریں۔ پورے سوالات لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ☆

تھاری نانی

فرزانہ روحی اسلم، سعودی عرب

ایک کویل کسی شریر بچے کی غلیل کا نشانہ بن گئی۔ اس کا ایک پَر زخمی ہو گیا اور وہ ایک انگور کی بیل پر گری، اور وہیں بیٹھی رہ گئی۔ کویل نے سوچا کہ جب تک اس کے زخم ٹھیک نہ ہو جائیں، وہ انگور کھا کر گزارا کرے گی۔

اُدھر ایک لومڑی بہت دنوں سے اس انتظار میں تھی کہ کب انگور کی بیلوں پر لٹکے ہوئے ہرے انگور پک کر پیلے ہوں اور وہ انھیں اچک لے۔ انگور کا خیال آتے ہی اس کے منھ میں پانی بھر آتا اور وہ للچائی ہوئی نظروں سے انگور کی بیل کو دیکھ کر اندازہ کرتی کہ کب انگور پکیں گے اور وزنی ہو کر پورا خوشہ نیچے کی جانب لٹک آئے گا اور وہ آنکھیں بند کر کے انگور کھائے گی۔ لومڑی نے سوچا، آج انگور کی بیل دیکھ آؤں کہ کتنے کچے ہیں اور کتنے پکے، لہٰذا وہ اپنے گھر سے نکلی۔ وہ انگور کی بیل تک پہنچی، جو پہلے سے کافی پھیل چکی تھی اور خوب پکّے پکّے انگور کے خوشے لٹکے تھے۔ ابھی اس نے اوپر دیکھا ہی تھا کہ کویل کوکی۔

لومڑی بولی: ''کون ہے؟''

''کوکوکو......'' کوئل پھر کوکی۔

شاید انگور کی چوکیداری پر کوئی پرندہ ہے۔ لومڑی نے سوچا، پھر بلند آواز سے بولی: ''کون ہے انگور کی بیل پر؟''

کویل نے دل میں سوچا۔ یہ لومڑی تو لالچ سے انگور کو دیکھ رہی ہے، کہیں جھپٹ ہی نہ لے۔ اگر ایسا ہو گیا تو بیل ہلے گی اور میں گر جاؤں گی۔ پھر تو یہ مجھے زندہ ہی کھا لے گی۔

کویل کو ترکیب سوجھی، بولی: ''میں انگور کی بیٹی ہوں۔''

''انگور کی بیٹی؟ ہیں...... یہ کیا رشتہ ہے؟'' لومڑی حیران ہو رہی تھی۔

کویل پھر کوکی اور بولی: ''اس پودے نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہے اور کہا ہے کہ میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں کہ کہیں کوئی اسے پکنے سے پہلے ہی توڑ نہ لے۔''

کویل کی بات سن کر لومڑی بولی: ''تمھیں تو اس وقت آم کے پیڑ پر ہونا چاہیے یا جامن کترنا چاہیے۔ تم انگور کی نازک بیل پر کیوں قبضہ جمائے بیٹھی ہو؟''

کویل بولی: ''اور تم یہاں کیوں آ گئی ہو؟ تمھیں معلوم نہیں کہ انگور ابھی کچے ہیں اور کچے انگور کھٹے ہوتے ہیں۔''

لومڑی تو تھی ہی سدا کی چالاک، بولی: ''وہ میری نانی کی پَرنانی کے دور میں انگور کھٹے ہوتے تھے۔ اب ہمارے دور میں نہیں ہوتے۔''

کویل بھی لومڑی سے دو چار ہاتھ آگے نکلی، جھٹ بولی: ''ہاں تو آم کے پیڑ پر بھی میری نانی کی پَرنانی بیٹھا کرتی تھی۔ ہم تو اب انگور کی بیل پر لٹک کر کوکتے ہیں۔ ہماری سریلی آواز سن کر انگور خوشی سے رسیلے ہو جاتے ہیں اور خوب پھلتے پھولتے ہیں۔''

لومڑی بولی: ''تا کہ میں آ کر انگور کے خوشے اچک لوں۔ تو لو، میں آ گئی۔'' یہ کہہ کر لومڑی نے ایک چھلانگ لگائی، تا کہ انگور کے لٹکتے خوشے کھا سکے۔

کویل چلائی: ''ٹھیرو...... یہ کیا کر رہی ہو؟ تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ اپنے بڑوں کی بات بھول رہی ہو۔''

لومڑی رک گئی: ''کیوں کیا ہوا۔''

کوئل بولی: ''تمھیں یاد نہیں ہے۔ تمھاری نانی کی پَر نانی نے کہا تھا کہ انگور کھٹے ہیں۔ واقعی انگور کھٹے ہی ہیں۔''

لومڑی نے کہا: ''نانی کی پرنانی والی غلطی میں نہیں کروں گی اور انگور کھٹے ہوں یا میٹھے، میں انھیں ضرور کھاؤں گی۔''

کوئل بولی: ''اگر تم نے بڑوں کی بات یاد نہ رکھی اور اس پر عمل نہ کیا تو تمھیں سزا ملے گی۔ کھٹے انگور کھانے سے تمھارا گلا خراب ہو جائے گا اور تم یہ کسی کو نہیں بتا سکو گی کہ انگور کھٹے ہیں یا میٹھے۔''

''ہیں ...... یہ کوئل نے کیا کہا! میرا گلا خراب ہو جائے گا۔'' لومڑی سوچ میں پڑ گئی۔

کوئل بولی: میرا کام تھا تمھیں بتانا، سو بتا دیا۔ اب تمھاری مرضی انگور کھاؤ یا گلا بچاؤ۔''

لومڑی سوچنے لگی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ انگور کھاؤں تو گلا خراب ہو گا، اگر گلا خراب ہو گا تو رات کو آواز کیسے نکالوں گی۔ اگر آواز نہ نکالوں تو میرے دوستوں کو کیسے پتا چلے گا کہ میں جاگ رہی ہوں یا سو چکی ہوں۔ اگر انگور نہ کھاؤں تو دنیا کو کیسے معلوم ہو گا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب انگور میٹھے ہو گئے ہیں۔

کوئل نے جب یہ دیکھا کہ لومڑی وہاں سے ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے تو بولی: ''بی لومڑی! انگور کھٹے ہوتے ہیں اور ہمیشہ کھٹے ہی رہیں گے۔ تم کیوں اپنا وقت برباد اور گلا خراب کرتی ہو۔ جاؤ، رات کے گانے کی تیاری کرو۔''

''کون سارات کا گانا؟''لومڑی نے پوچھا۔

کویل بولی: ''وہی رات کا گانا جسے تمھاری نانی گاتی تھیں تو انگور کے خوشے پر جگنو ناچنے لگتے تھے اور وہ جگنو کی روشنی میں انگور توڑ توڑ کر کھاتی تھیں اور دن میں شور مچاتی تھیں کہ انگور کھٹے ہیں، تاکہ دوسری لومڑیاں انگور سے دور رہیں۔''

''اچھا۔'' کویل کی بات سن کر لومڑی حیران ہوگئی۔ بولی: تمھیں کیسے معلوم ہوا؟''

کویل نے بتایا کہ اسی انگور کی بیل نے مجھے یہ پرانی کہانی سنائی ہے۔

لومڑی بولی: ''ٹھیک ہے تو پھر میں رات کو آجاتی ہوں، تاکہ سارے انگور میں خود ہی کھا جاؤں۔''

جیسے ہی دن ڈھلا اور اندھیرا چھانے لگا، لومڑی نے انگور کی بیل کے پاس جانے کی تیاری شروع کردی۔ دبے پاؤں جب وہ وہاں پہنچی تو دور سے ہی اس نے دیکھ لیا کہ انگور کے خوشوں پر جگنو ناچ رہے تھے۔

کویل نے دیکھا کہ لومڑی تو دُھن کی پکی نکلی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی ہے تو دبک کر بیٹھ گئی۔ جیسے ہی لومڑی قریب آئی۔ کوئل نے اپنے پر پھڑپھڑائے۔

لومڑی جہاں تھی، وہیں رک گئی۔ پھر خاموشی پا کر آگے بڑھی۔

کویل نے اپنے پر پھڑپھڑائے۔ لومڑی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''کک ...... کون ہے؟''

''تمھاری نانی۔'' کویل نے آواز بدل کر کہا۔

''مگر ان کا تو بہت عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔'' لومڑی بولی۔

''ہاں تمھاری نانی مر چکی ہے۔ اُس کی روح تو زندہ ہے اور اسی انگور کی بیل پر اٹکی ہے۔''

لومڑی اور زیادہ ڈر گئی: ''مگر آپ کو تو بھیڑیے نے پھاڑ کھایا تھا!''

''بھیڑیا پھاڑے یا چیتا کھائے، مجھے تو انگور کھانے تھے۔ سو ابھی تک میری روح انگور کی بیل پر اٹکی ہوئی ہے۔ اچھا ہوا تُو بھی آ گئی میری ننھی لومڑی! اب دونوں مل کر انگور کی بیل پر لٹکے رہیں گے۔''

لومڑی کے منھ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس کا حال دیکھ کر کویل کی ہنسی چھوٹ گئی اور اس کے حلق سے ایک کُوک نکل گئی۔ لومڑی چونک پڑی: ''ارے! یہ تو کویل کی

آواز ہے۔''

کویل ہوشیار ہوگئی اور ایک قہقہہ لگا کر بولی: ''ہا ہا ہا ہا۔ میں دن میں کویل بن جاتی ہوں اور رات میں تمھاری نانی۔ آؤ نا...... ! میں تمھیں انگور کھلاؤں۔''

''نہیں نانی ! انگور کھٹے ہیں...... انگور کھٹے ہیں۔'' یہ کہتی ہوئی لومڑی جنگل کی طرف واپس بھاگ گئی۔ لومڑی کو بھاگتا دیکھ کر کویل کی جان میں جان آ گئی۔ اب بھی جب کویل کسی درخت پر بیٹھتی ہے تو خوب کوکتی ہے۔ وہ کہتی ہے، ہے کوئی جو میرے ساتھ اس درخت کا پھل کھائے، مگر کوئی پرندہ جواب نہیں دیتا۔ سوائے کسی دوسری کویل کے جو کہیں آس پاس موجود ہوتی ہے۔ البتہ انسان کویل کی آواز سن کر ضرور خوشی محسوس کرتا ہے۔

☆

شیخی باز

احمد عدنان طارق

شیخی ہانکنے کی بری عادت کی وجہ سے سمیع اکثر مشکل میں پھنس جاتا تھا۔ ایک دن اس کا دوست شہیر اپنا کھلونا ریلوے انجن لے کر دوستوں کو دکھانے اسکول آیا تو سمیع نے حسبِ عادت منھ چڑھاتے ہوئے کہا: ”یہ تو چابی والا انجن ہے۔ کبھی میرے گھر آ کر دیکھو، میرے پاس بجلی سے چلنے والا انجن ہے۔“

شہیر نے اس سے کہا کہ شیخی نہ بگھارو۔ لیکن دل ہی دل میں وہ رنجیدہ ہو گیا کہ اُس کے کھلونے کو سمیع نے پسند نہیں کیا۔

ایک دن سمیع گھر سے اسکول جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے ایک انتہائی خوب صورت چاقو مِلا۔ یہ پیلے رنگ کا تھا، لیکن اُس کا دستہ نیلے رنگ کا تھا۔ وہ کھڑا ہو کر

چاقو کو دیکھتا رہا اور سوچتا بھی رہا کہ یہ کس کا ہو سکتا ہے؟ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید اُس کا مالک اسے نظر آ جائے۔ اُسے تھوڑی دور ایک بہت ہی چھوٹے قد والا شخص نظر آیا۔ جو اِدھر اُدھر زمین پر کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ سمیع نے اُسے آواز دی: ''بھائی! اگر تمھارا چاقو گر گیا ہے تو وہ مجھے ملا ہے۔''

چھوٹے قد والے شخص نے اُس کی طرف دیکھا تو سمیع سٹپٹا سا گیا۔ اُس کا قد بہت چھوٹا تھا، لیکن اُس کی عمر کافی زیادہ لگتی تھی۔ اُس کا لباس بھی عجیب و غریب تھا۔ اُس نے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اُس کی ٹانگوں پر بہت لمبی جرابیں تھیں۔ اُس نے سر پر آگے سے نوک دار ٹوپی پہنے ہوئی تھی، جس کے پھندنے میں ایک گھنٹی بھی لگی ہوئی تھی۔

''چلو، اچھا ہوا میرا چاقو تمھیں مل گیا۔'' چھوٹے قد والے شخص نے سمیع کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگا کہ میرا نام عزریق ہے اور تمھارا نام کیا ہے؟

''میرا نام سمیع ہے۔ تمھارا چاقو عجیب طرح کا ہے۔ میرے پاس گھر میں ایک چاقو ہے، وہ تمھارے چاقو سے زیادہ تیز اور خوب صورت ہے۔'' سمیع نے حسبِ عادت شیخی بھگاری۔

عزریق بھی بول اُٹھا: ''میرا چاقو زیادہ تیز ہے۔ یہ تو کسی درخت کے تنے کو منٹوں میں چیر دے۔''

سمیع نے کہا: ''جھوٹ، تم شیخی بھگار رہے ہو۔''

عزریق نے کہا: ''یہ کام تو تم بھی کر رہے ہو، لیکن میں تمھیں سچ بتا رہا ہوں اور تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

اور پھر سمیع انتہائی حیران ہوا، جب عزریق قریبی ایک چھوٹے سے کیلے کے

درخت کے پاس گیا اور چاقو سے اس کے تنے کو بیچ سے کاٹ دیا، جس سے وہ دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر پڑا۔ سمیع گڑ بڑا گیا۔ اُس نے کہا: ''ٹھیک ہے تمھارا چاقو تیز ہے، لیکن اگر اسی طرح تم درخت کاٹو گے تو تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔''

عزریق نے یہ سن کر کہا: ''میں صرف تمھیں دکھا رہا تھا۔''

پھر اُس نے گرا ہوا کیلے کا درخت اُٹھایا۔ جیب سے ایک ٹیوب نکال کر تنے پر ملی۔ کٹا ہوا حصہ اُس کی جگہ پر رکھا۔ درخت پر ہاتھ پھیرا تو درخت جوں کا توں پہلے کی طرح ہو گیا، جیسے کبھی کٹا ہی نہیں تھا۔ پھر اُس نے سمیع کو بتایا: ''اب یہ دوبارہ معمول کے مطابق اُگتا رہے گا۔ میری اس ٹیوب میں سب سے مضبوط جوڑنے والی گوند ہے۔''

سمیع نے اُسے جواب دیا: ''گھر میں میرے پاس بھی ایسی گوند ہے، جو ہر ٹوٹی چیز کو جوڑ دیتی ہے۔''

عزیق بولا: ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ دنیا میں اس سے زیادہ مضبوط گوند کہیں نہیں۔ یہ تمھارے پاؤں زمین سے جوڑ سکتی ہے۔''

سمیع نے جواب دیا: ''تم شیخی خورے ہو۔ تمھاری بات تو سننی ہی نہیں چاہیے۔''

عزیق نے کہا: ''میں ثابت کر دیتا ہوں۔'' پھر اُس نے جان بوجھ کر سمیع کو جھکائی دی تو وہ زمین پر گر پڑا۔ عزیق نے جلدی جلدی اُس کے دونوں پیروں پر گوند لگا دی۔ سمیع غصے میں بھرا ہوا جب پیروں پر دوبارہ کھڑا ہوا، تا کہ عزیق کو ایک تھپڑ بھی رسید کر دے۔ تب اُسے اندازہ ہوا کہ عزیق سچ کہہ رہا تھا، کیوں کہ اس کے پاؤں زمین پر واقعی جڑ گئے تھے اور وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ وہ غصے سے بولا: ''میرے قدم زمین سے جڑ گئے ہیں۔ اپنی گوند کا اثر ختم کرو۔''

عزیق نے سخت لہجے میں کہا: ''ہرگز نہیں، اپنے پاؤں جوتوں سے باہر نکالو اور پیدل گھر جاؤ۔''

سمیع کو یہی کرنا پڑا۔ اس نے جوتوں سے پاؤں نکالے اور عزیق کی طرف بڑھا اور چلّایا: ''میں تمھیں سبق سکھاتا ہوں۔ تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ میں اپنی جماعت میں سب سے تکڑا لڑکا ہوں۔''

لیکن عزیق تیزی سے اُسے جھکائی دے گیا۔ تب غصے میں بھرے سمیع نے اُسے پھر للکارا: ''اس طرح جھکائیاں دے کر تم کب تک بچتے رہو گے! میں پورے اسکول میں سب سے تیز بھاگتا ہوں۔ آخر میں تمھیں پکڑ ہی لوں گا۔''

یہ سن کر عزیق نے اُسے بتایا کہ وہ دنیا میں موجود کسی بچے سے بھی تیز بھاگ سکتا ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ عزیق اتنا تیز تھا کہ چلنے میں ہوا کو مات دیتا تھا۔ سمیع اُسے کسی

صورت نہیں پکڑ سکتا تھا۔ عزیق گھاس پر بیٹھ گیا اور اُس نے سمیع کو نزدیک آنے دیا۔ جب وہ نزدیک آیا تو عزیق نے اُسے دھمکی دیتے ہوئے کہا: ''مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ تم مجھے بڑے زور سے تھپڑ مار سکتے ہو، لیکن جواب میں جو تھپڑ تمھیں میں رسید کروں گا، اُس سے تمھارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

سمیع کو اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے عزیق کو ایک تھپڑ رسید کیا۔ تھپڑ کھا کر عزیق فوراً سنبھل گیا اور اُس نے ایک جوابی تھپڑ سمیع کو اس شدت سے رسید کیا کہ سمیع اچھل کر زمین پر گرا اور اُس نے تین قلابازیاں کھائیں۔ وہ جب اُٹھ کر بیٹھا تو شاید وقتی طور پر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا، پوچھنے لگا: ''یہ مجھے کیا ہوا تھا؟''

عزیق نے اُسے یاد دلایا کہ اس کے تھپڑ نے اس کی یہ حالت کی ہے۔ حال آنکہ وہ پہلے ہی سمیع کو خبردار کر چکا تھا۔

سمیع اب رونے لگا تھا: ''میں اپنی امی اور ابا کو بتاؤں گا، کیوں کہ وہ اتنے طاقت ور ہیں کہ تم میرے سامنے معافی کے لیے گڑگڑاؤ گے۔''

عزیق نے اُسے بتایا کہ اُس کے ماں باپ بھی تگڑے ہیں اور وہ دیکھو......! وہ اِدھر ہی آ رہے ہیں اور تمھیں پتا ہے کہ وہ تم جیسے بدتمیز لڑکوں سے کیا سلوک کرتے ہیں؟

سمیع نے اُدھر دیکھا جدھر عزیق نے اشارہ کیا تھا تو وہ حیران رہ گیا۔ عزیق کے لمبے تڑنگے ماں باپ جو شکل سے ہی خوف ناک نظر آتے تھے، آ رہے تھے۔ اور وہ اتنے لمبے تھے کہ پہلے سمیع سمجھا کہ شاید وہ جن ہیں۔ اُس نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ ان کے ساتھ بدتمیزی اُس کے لیے فائدے مند نہیں ہوگی۔ اُس نے عزیق سے کہا: ''انھیں نہ بلاؤ، وہ مجھے دور ہی سے نظر آ رہے ہیں۔ کتنے مضبوط اور تگڑے ہیں۔ تم آخر رہتے کہاں ہو؟''

عزریق نے بتایا: ''میں جنگل میں رہتا ہوں۔''

پھر اس نے سمیع سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟

سمیع نے جواب دیا: ''گاؤں میں! جہاں ہمارا گھر سب سے بڑا ہے اور اس میں بہت بڑا باغیچہ ہے اور ایک سوئمنگ پول بھی ہے۔''

عزریق نے اسے بتایا: ''میں ایک قلعے میں رہتا ہوں۔ میرے باغ کی حفاظت کے لیے پچاس مالی دن رات کام کرتے ہیں اور ہمارے ہاں سوئمنگ پول کی جگہ جھیل ہے جہاں کشتی چلتی ہے۔''

سمیع یہ سن کر پھر غصے میں آ گیا۔ اُس نے عزریق کو پھر جھوٹا کہہ دیا۔

عزریق نے کہا: ''میں تمھیں ایک تھپڑ اور ماروں گا، اگر تم نے مجھے جھوٹا کہا۔ میں تمھاری طرح شیخی خورا نہیں ہوں۔ میں جو بتا رہا ہوں، وہ ہی سچ ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں دکھاتا ہوں۔''

اس نے سمیع کو ہاتھ سے پکڑا اور اُسے کھینچتا ہوا لے کر چلا۔ کچھ ہی دیر میں وہ منزل تک پہنچ گئے۔ سمیع کی آنکھیں سامنے کا منظر دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ایک بہت ہی بڑے لکڑی کے گیٹ کے سامنے پہنچے تھے، جو بہت بڑی دیواروں میں جڑا ہوا تھا۔ عزریق نے دروازہ کھولا تو اندر چھوٹا سا نہیں بلکہ چراہ گاہ جتنا بڑا باغ تھا۔ وہ ایک بہت بڑے قلعے کے اندر موجود تھے، جس کے اطراف بڑے عظیم الشان برج کھڑے تھے۔ مالیوں کی ایک جماعت تھی، جو اتنے بڑے باغ کی باغبانی پر مامور تھی۔ پھر سمیع کی نظر جھیل پر پڑی، جو شاید اس قلعے کا سوئمنگ پول تھا اور اُس میں ایک کشتی بھی نظر آ رہی تھی۔ سمیع کے منہ سے بے اختیار نکلا: ''کتنی خوب صورت جگہ ہے۔'' پھر اُس نے عزریق

سے پوچھا کہ کیا اُس کے پاس کوئی سائیکل ہے، کیوں کہ میرے پاس گھر میں اتنی خوب صورت سائیکل ہے، جو دنیا میں سب سے بہترین ہے۔ اس کی گھنٹی کی آواز اتنی تیز ہے کہ اُس کے راستے میں کوئی نہیں آتا۔

عزیق نے یہ سن کر کہا: ''چلو، میں تمھیں اپنی سائیکل دکھاتا ہوں۔'' پھر وہ نزدیک بنے سائیکل اسٹینڈ کی طرف گئے۔ عزیق نے دروازہ کھول کر اس میں سے انتہائی خوب صورت سائیکل نکالی اور کہنے لگا: ''یہ سونے کی بنی ہوئی ہے۔'' پھر وہ اُس پر چڑھا اور فوراً ہی سائیکل چلاتا نظروں سے غائب ہوگیا۔ پھر وہ اچانک ہی آیا اور گھنٹی بجاتے ہوئے سیدھا سمیع کی طرف آیا۔ یہ اس طرح کی اونچی آواز والی گھنٹی تھی، جیسے کسی گھنٹہ گھر کے گھڑیال سے آواز آرہی ہو۔ سمیع کو اپنے ہاتھ کانوں پر رکھنے پڑے اور وہ بڑی مشکل سے عزیق کی سائیکل کے راستے سے ہٹ سکا۔ پھر وہ چلایا: ''گھنٹی نہ بجاؤ، ورنہ میں بہرہ ہو جاؤں گا۔''

عزیق رک گیا۔ وہ سائیکل سے اُترا اور سمیع سے پوچھنے لگا: ''کیا اُسے کچھ اور بھی دیکھنا ہے؟''

سمیع نے کہا: ''اب مجھے گھر جانا چاہیے، میرا کتا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ میرے کتے سے بہتر کوئی کتا ہو ہی نہیں سکتا۔ اُس کے ایک دفعہ بھونکنے سے بڑے بڑے ڈاکو بھاگ جاتے ہیں اور اُس کے دانت اتنے بڑے اور تیز ہیں۔ تم اُنھیں دیکھ لو تو ڈر کر بھاگنا بھی بھول جاؤ گے۔''

عزیق نے کہا: ''میرے پاس بھی ایک کتا ہے۔ وہ بھی بہت اچھا بھونکتا ہے۔ تمھیں اسے دیکھنا چاہیے۔ اس کے دانت بھی بہت تیز ہیں۔ کل اسے گھاس کاٹنے والی

مشین پسند نہیں آئی، تو اُس نے دانتوں سے وہ چباڈالی اور اگر تم بھاگنا چاہو تو تم اس کی ٹانگیں دیکھ کر سمجھ جاؤ گے کہ اس سے بھاگنا ناممکن ہے۔''

''اوہ! تم پھر شیخی بگھار رہے ہو۔'' سمیع نے اُکتا کر کہا۔ عزیق اُسے لے کر ایک بڑے کمرے کے پاس گیا اور اس کا دروازہ کھولا اور اندر سے ایک بڑے سائز کا کتا نکلا، جو کم عمر تھا، لیکن اس کا قد ڈرانے والا تھا۔ وہ بھونکا تو ایسے لگا جیسے کلاشنکوف سے فائر ہوئے ہوں۔ اُس نے دانت پیسے تو ایسا لگا جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اُس نے اپنے بڑے بڑے دانت نکالے تو سمیع کو پسینا آ گیا۔ واقعی یہ کتا گھاس کاٹنے والی مشین چبا سکتا تھا۔ سمیع بے اختیار دوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ اُس کتے سے بہت خوف زدہ تھا۔ کتا بھی سمیع کے پیچھے بھاگا۔ کتا جیسے اس کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ وہ بار بار سمیع کے پیروں میں آتا۔ اُسے اب یقین ہو چلا تھا کہ یہ کتا اس کی ایک ٹانگ بالکل اسی طرح چبانے والا ہے، جس طرح اُس کے کتے نے ایک مرتبہ اس کے بابا کی چپل چبا ڈالی تھی۔ بے چارہ سمیع ننگے پاؤں بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔ اسے یہی ڈر لگا رہا کہ اب اُس کی ایڑھی کتے کے منھ میں آنے والی ہے۔ آخر وہ گھر میں گھسا اور اندر سے اُس نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ ایک کرسی پر گر گیا۔ ننگے پاؤں دوڑ دوڑ کر اس کی جرابوں میں سوراخ ہو گئے اور اس کے دونوں پیر بھی زخمی ہو گئے تھے۔

اُس نے امی کو سارا قصہ سنایا تو انھیں اس کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا، لیکن پھر بھی وہ کہنے لگیں: ''اگر یہ صحیح ہے تو تمھیں ایک چیز یاد رکھنی چاہیے۔ اگر دوبارہ تم نے کوئی بڑ ہانکی تو کوئی عزیق تمھیں دوبارہ بھی مل سکتا ہے اور پھر اس کا انجام اب تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

مجھے یقین ہے کہ سمیع نے دوبارہ کبھی بڑ نہیں ہانکی ہو گی اور میں یہ بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عزیق کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا ہو گا۔ ☆

چھینک کی دہشت

ثمینہ پروین

سرمد ارمان انتہائی دولت مند آدمی تھا۔ وہ ایک خطرناک بیماری کی وجہ سے اپنی زندگی سے عاجز آچکا تھا۔ مرض اس قدر شدید تھا کہ زندہ رہنا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ طب کے شعبے میں بہتری آئی تھی اور بہت سے پرانے مہلک امراض کا علاج دریافت ہو چکا تھا، لیکن کچھ ایسے نئے امراض بھی سامنے آگئے تھے، جن کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔

ایک ایسی ٹائم مشین ایجاد کر لی گئی تھی، جو انسان کو مستقبل میں پہنچا سکتی تھی۔ اس پر تجربات کیے جا چکے تھے۔ کئی لوگ مستقبل میں جا کر واپس آچکے تھے، جنھوں نے بتایا تھا کہ وہ انتہائی ترقی یافتہ دور ہے اور وہاں کوئی شخص کسی قسم کی بیماری میں مبتلا نہیں ہے۔

سرمد کو اچانک یہ خیال آیا کہ کیوں نہ مستقبل میں جا کر اپنے مرض کا علاج کرالے۔ اس نے دوستوں اور عزیزوں سے مشورہ کیا۔ بیشتر لوگوں نے اس ترکیب کو پسند کیا۔ آخر سرمد کو اس مشین کے ذریعے سے ایک ہزار سال بعد کے زمانے میں بھیج دیا گیا۔

......☆......

سرمد نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی، لیکن وہ جسم کو حرکت نہ دے سکا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن حواس پوری طرح کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی گردن کو حرکت دینے کے قابل ہوا۔ اس نے گردن گھمائی اور آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جس حال میں تھا، اس کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ نہیں

لگا سکا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہاں کی دیواریں روشنی کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر طرف روشنی کا حصار تھا اور درجۂ حرارت بہت کم تھا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ ایک لمبی سانس لے کر اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ جس بستر پر لیٹا تھا، وہ انتہائی نرم و ملائم تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے، اسے اندازہ نہیں تھا۔

اچانک اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس طرف کی روشن دیوار ایک دروازے جتنی تاریک ہو گئی۔ اس تاریکی میں سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ اس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا، جب مستقبل میں آنے کے بعد اسے مشین سے نکالا گیا تھا۔ پھر شاید علاج کے لیے اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا، جو مکمل طور پر گنجا تھا۔

''یہاں تو کافی سردی ہے!'' سرمد نے آنے والے گنجے ڈاکٹر سے کہا۔

''نہیں، یہاں کا درجۂ حرارت یکساں رکھا جاتا ہے، جو ہر آدمی کے لیے مناسب ہے۔ تم بھی چند دنوں میں اس کے عادی ہو جاؤ گے۔'' ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا: ''تمھارا نام سرمد ہے؟''

''ہاں، یہی نام ہے میرا۔'' سرمد نے اس سے پوچھا: ''کیا تم سرجن ہو؟''

ڈاکٹر عجیب انداز سے ہنسا اور اس نے سرمد کے ماتھے پر لگا اسٹیکر اتارتے ہوئے کہا: ''نہیں، اب سرجری کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہر مرض کا علاج مختلف شعاعوں اور روشنیوں سے کیا جاتا ہے، لیکن آج کے دور میں تو کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔''

سرمد کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا: ''تو پھر انسانی اعضا کی تبدیلی کا عمل

کیسے ہوتا ہے؟''

ڈاکٹر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''سارا کام صرف شعاعوں سے کیا جاتا ہے۔ صدیوں پرانے اوزار اب استعمال نہیں ہوتے۔ یہاں زیادہ تر کام روبوٹ سے لیا جاتا ہے۔ تمھارا جسمانی معائنہ مکمل ہو چکا ہے اور تم ایک ماہرِ امراض کے زیرِ نگرانی ہو۔''

گنجے ڈاکٹر نے جیب سے شیشے کی ایک ٹیوب نکالی اور سرمد کا منھ کھول کر ٹیوب کے سرے پر لگا بٹن دبایا تو سبز رنگ کی روشنی نکلنے لگی۔ اس معائنے کے بعد اس نے ڈاکٹر سے پوچھا: ''میں اس وقت کہاں ہوں؟''

ڈاکٹر نے اسے بتایا: ''یہ اسپتال کا ایک بڑا ہال ہے، جس میں ہر آدمی روشنی کی دیواروں کے ذریعے سے علاحدہ رکھا جاتا ہے۔ تم ان روشن دیواروں کو حفاظتی دیوار کہہ سکتے ہو۔''

''ابھی تم نے کہا تھا کہ میں ایک ماہرِ امراض کی زیرِ نگرانی ہوں۔ کیا انھوں نے میرے مرض کا علاج ڈھونڈ نکالا ہے؟''

ڈاکٹر جواب دینے سے پہلے مسکراتا رہا، پھر بڑے نرم لہجے میں کہا: ''میرے دوست! مطمئن رہو۔ سمجھو کہ اب تمھارا مرض گئی گزری بات ہو گئی۔ اب دنیا میں ہر مرض کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تمھیں یہاں کوئی مریض نظر نہیں آئے گا۔''

اسی دوران اس نے سرمد کی ایک انگلی میں ایک فیتہ سا لگا دیا، جس میں سے نیلے رنگ کی شعائیں نکل رہی تھیں۔

''تو کیا دنیا میں ایک میں ہی مریض ہوں؟''

''ہاں، صرف تم ہی ایک مریض ہو جو ماضی سے یہاں بھیجے گئے ہو۔ علاج کے

بعد ہم تمھیں واپس ماضی میں روانہ کردیں گے۔''

''اور وارڈ میں یہ جو دوسرے مریض ہیں، وہ......'' سرمد نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ مریض نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر نے سرمد کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا: ''وہ سب کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوئے ہیں یا اپنی کسی ضرورت کے تحت آئے ہیں۔''

سرمد نے روشنی کی دیواروں کے پار غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر نے مزید وضاحت کی: ''تمھارے سامنے والے کمرے میں جو آدمی ہے، وہ اپنی ٹانگیں تبدیل کرانے کے لیے آیا ہے۔ برابر والے کمرے میں ایک شخص اپنا خون تبدیل کروا رہا ہے، تاکہ وہ زیادہ چست رہ سکے۔ بائیں طرف والے کمرے میں ایک آدمی اپنا دماغ تبدیل کروا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا نیا دماغ تیزی سے فیصلے کر سکے۔''

''بہت خوب۔'' سرمد خوشی سے کِھل اٹھا: ''اس کا مطلب ہے میں نے دوستوں کا مشورہ مان کر اچھا کیا۔ اگر اس دور میں ہوتا تو شاید مر چکا ہوتا۔''

ڈاکٹر نے کہا: ''ہاں، تم نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمھارے مرض کا علاج معلوم کر لیا گیا ہے، اب دوا تیار کی جا رہی ہے۔''

سرمد نے تجسس سے پوچھا: ''دوا کون تیار کر رہا ہے؟''

''ماہر امراض۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا: ''میں تمھیں یہی بتانے آیا تھا کہ دوا کی تیاری میں چند گھنٹے لگیں گے۔ ماہر امراض کو تمھارے مرض کی تحقیق کرنے کے لیے صدیوں پرانی کتابوں کو کھنگالنا پڑا ہے۔''

یہ سن کر سرمد نے پُرجوش لہجے میں کہا: ''میں جلد از جلد صحت یاب ہونے کے بعد

باہر نکل کر اس دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ یقیناً یہ دنیا جنت سے کم نہیں ہوگی ۔''

''ٹھیک ہے، تمھاری یہ خواہش جلد پوری کر دی جائے گی ۔ اب تم آرام سے لیٹ کر انتظار کرو ۔''

ڈاکٹر واپس روشن دیوار کی طرف بڑھ گیا ۔ دیوار کے قریب پہنچتے ہی اس میں پھر دروازے کے برابر تاریکی پیدا ہوگئی اور ڈاکٹر اس میں داخل ہو کر غائب ہوگیا ۔ سرمد انتظار کرنے لگا ۔ سردی سے اس کے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو رہی تھی ۔ وہ لیٹے لیٹے ماضی کے خیالوں میں گم ہوگیا ۔ وقت گزر نہیں رہا تھا ۔ اس کے کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے ۔

اچانک اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ اس نے چونک کر روشن دیوار کی طرف دیکھا ۔ دیوار میں اسی طرح دروازے جتنی تاریکی ظاہر ہوئی ۔ اس تاریکی میں سے سفید کوٹ پہنے ایک آدمی نمودار ہوا، جس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ تھا ۔ ایسا بیگ ڈاکٹروں کے پاس ہوتا ہے ۔ اس کے پیچھے وہی گنجا ڈاکٹر تھا، جو کچھ دیر پہلے اس کے پاس تھا ۔ وہ دونوں قریب آئے تو سرمد چونک گیا ۔ وہ دونوں ہی گنجے تھے ۔

''ماہرِ امراض ؟'' سرمد نے آہستہ آواز میں پوچھا ۔

''ہاں، یہ ماہرِ امراض ہیں ۔'' پہلے والے گنجے ڈاکٹر نے بتایا: ''تمھاری دوا تیار ہوگئی ہے ۔''

''بہت بہت شکریہ ۔''

دوسرے گنجے ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا، جس میں مختلف رنگوں کی ٹیوبیں اور سرنج نظر آ رہی تھیں ۔ ماہرِ امراض نے ایک سرنج اٹھائی اور اس کے سرے پر لگی پلاسٹک جیسی تہ الگ کر دی ۔ اس سرنج کا سرا گول تھا، لیکن اس میں سوئی نہیں تھی، بلکہ ایک ننھا سا سوراخ

تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج کا گول سرا سرمد کے بازو سے لگا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ سوراخ میں سے سوئی باہر نکلے گی۔ سوئی کی چبھن سے وہ ڈر سا گیا، لیکن معمولی سے گدگدی ہوئی اور سرنج ہٹالی گئی۔ اسے ذرا بھی تکلیف نہ ہوئی۔ وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا، لیکن ڈاکٹر کے چہرے پر جوابی مسکراہٹ دیکھنے سے پہلے ہی وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے غور سے دیکھا اور تاریک دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

......☆......

اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ اسپتال کے اس کمرے میں صبح و شام کا اندازہ لگانا مشکل تھا، لیکن وہ ڈاکٹر سے سن چکا تھا کہ اگر کمرے میں خنکی کم ہو تو اس کا مطلب ہے کہ دن نکل آیا ہے۔ ایک آدمی اس پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ماہرِ امراض تھا۔ وہ ایک گول سی نلکی سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اس چمک دار نلکی کو سرمد کے جسم کے مختلف حصوں میں داخل کر رہا تھا، لیکن اسے بالکل تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔

''یہ کیا چیز ہے، ڈاکٹر؟'' اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے بتایا: ''یہ مرض کی کیفیت معلوم کرنے کا آلہ ہے۔ میں معائنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم جس مرض کی وجہ سے پریشان تھے، وہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔''

ڈاکٹر نے ایک بٹن دبایا اور آلۂ تشخیص کی روشنی بجھ گئی۔ سرمد کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو جھلملانے لگے۔

''خدا کا شکر ہے۔'' اس کے منھ سے نکلا اور ساتھ ہی اسے ایک زوردار چھینک آ گئی۔

''یہ کیا ہوا!'' ماہرِ امراض بدحواس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

''کچھ نہیں۔'' سرمد نے اطمینان سے کہا: ''مجھے چھینک آ گئی تھی۔ شاید سردی کی وجہ سے مجھے زکام ہو گیا ہے۔''

''چھینک!......زکام!'' ڈاکٹر کے لیے یہ دونوں الفاظ بالکل نئے تھے۔ ڈاکٹر کے چہرے سے خوف جھلک رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ سیاہ کوٹ پہنے دو آدمی اور تھے۔ سرمد نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں بھی گنجے تھے۔ سرمد نے ان کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ بہت پریشان اور خوف زدہ تھے۔

سرمد کو اسی وقت ایک اور چھینک آ گئی۔ اس نے کہا: ''کیا بات ہے؟ آپ لوگ کیوں پریشان ہیں، مجھے صرف معمولی سا زکام ہوا ہے۔''

تینوں گنجوں نے چہرے پر گیس ماسک لگا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نے سرمد کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔

''مجھے افسوس ہے دوست!'' قریب کھڑے ہوئے ماہرِ امراض کی آواز آئی: ''تم جسے زکام کہہ رہے ہو، یہ مرض ہمارے لیے نیا ہے اور ہمارے پاس اس کی کوئی دوا نہیں ہے۔ پرانی کتابوں سے نسخہ تلاش کرنے میں بہت وقت لگے گا اور اس دوران اس مرض کے پھیلنے کا خطرہ ہے۔ میرے علاوہ اعلا حکام کا بھی یہی خیال ہے کہ اس خطرناک مرض کو یہیں پر فوراً ختم کر دیا جائے اور اس کا ہمارے پاس صرف ہی طریقہ ہے کہ......''

ڈاکٹر نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور سرنج سرمد کے بازو سے لگا دی۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی سرمد کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مرض کے ساتھ ساتھ مریض بھی ختم ہو چکا تھا۔

☆

اِدھر اُدھر سے

شاگرد کی صدارت میں

مرسلہ : شمائلہ ذیشان، ملیر

مشہور شاعر شکیل بدایونی، جگر مراد آبادی کے شاگرد تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک بار راندیر (سورت) میں شکیل بدایونی کی صدارت میں مشاعرہ تھا۔ بیرونی شعرا میں حضرت جگر مراد آبادی بھی تشریف لائے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے شکیل نے مائک پر آ کر کہا: ''چوں کہ جگر صاحب میرے بزرگ ہیں، اس لیے میں اس مشاعرے کی صدارت کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔''

جگر صاحب نے فوراً مائک ہاتھ میں لیا اور کہا: ''اگر شکیل مجھے اپنا بزرگ تسلیم کرتے ہیں تو بحیثیت استاد میں انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مشاعرے کی صدارت کریں۔''

شکیل مجبور ہو گئے۔ تمام شاعر جب کلام پڑھ چکے اور صرف دو شاعر باقی رہ گئے، یعنی جگر صاحب اور خود شکیل جو صدر تھے، اس لیے آخری شاعر کے بعد فوراً شکیل مائک پر اپنا کلام سنانے آ گئے، تاکہ جگر صاحب سب سے آخر میں کلام سنائیں۔

لیکن جگر صاحب اُٹھ کر مائک پر آ گئے اور کہنے لگے: ''آپ صدر ہیں، آپ سب سے آخر میں اپنا کلام سنائیے گا۔''

اس پر شکیل فوراً بولے: ''جگر صاحب! اگر آپ مجھے صدر مانتے ہیں تو میں بحیثیت صدر آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ سب سے آخر میں کلام سنائیں گے۔''

محفل میں قہقہے بلند ہوئے اور جگر صاحب کو شکیل کی بات ماننی پڑی۔

دل چسپ امریکی قوانین

مرسلہ : عبدالرافع، لیاقت آباد

☆ ۱۹۳۰ء میں امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر ''اونیٹریو'' کی سٹی کونسل نے ایک قانون کی منظوری دی، جس کے تحت شہری حدود میں مرغ کے بانگ دینے پر پابندی لگادی گئی۔ اسی طرح ریاست ''مشی گن'' میں قانون سازی کر کے ایرپورٹ کی حدود کے ۳۰۰ فیٹ کے اندر مرغ کی اذان پر پابندی لگادی گئی تھی۔

☆ کیلی فورنیا میں لائسنس حاصل کیے بغیر چوہے پکڑنے کے لیے چوہے دان یا کسی دوسری چیز کے استعمال کی ممانعت کردی گئی تھی۔ اسی طرح ریاست ''اوہائیو'' کے شہر ''کلیولینڈ'' میں بھی شکار کا لائسنس حاصل کیے بغیر چوہے پکڑنا جرم قرار دیا گیا تھا۔

☆ جنوں بھوتوں کی کہانیاں سننا کس کو اچھا نہیں لگتا، لیکن امریکا کی ایک ریاست ''الی نوائے'' کے شہر ''اربانا'' کی سٹی کونسل نے ایک قانون پاس کیا، جس میں جنوں بھوتوں کی ڈراؤنی کہانیاں سنانا جرم تھا۔

☆ دوسرے کے خراٹوں پر قانون سازی صرف ریاست ''میساچوسٹس'' میں ہی کی گئی تھی۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کیے بغیر خراٹے لینے کو جرم قرار دیا گیا تھا۔

☆ امریکی ریاست ''ویسٹ ورجینیا'' کی کاؤنٹی ''نکولس'' کے منظور کردہ ایک قانون کے تحت پادریوں پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ اپنے وعظ کے دوران کوئی لطیفہ نہیں سنا سکتے۔

لیڈر

مرسلہ : تحریم خان، کراچی

روس کے سابق صدر خروشیف ایک مرتبہ بہت بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے روس کے لیڈر اسٹالن پر تنقید کر رہے تھے۔ خروشیف نے اسٹالن کے ظلم و جبر اور

زیادتیوں کی ایسی داستانیں سنائیں کہ مجمع دم بخود رہ گیا۔ مجمع میں کسی نے ایک چھوٹے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا: ''حضور! یہ سارے مظالم ہو رہے تھے، اس وقت آپ کیا کر رہے تھے؟ آپ نے اس ظلم و جبر کے خلاف کیا اقدام کیے؟'' اور اس کاغذ کے ٹکڑے کو آگے بڑھا دیا۔

یہ ٹکڑا آخر وشیف تک پہنچ گیا۔ خروشیف نے اسے پڑھا اور تھوڑی دیر کے لیے سکوت اختیار کیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ لاجواب ہو گئے ہیں، لیکن پھر ڈانٹ کر پوچھا: ''جس نے یہ سوال کیا ہے، وہ کھڑا ہو جائے!''

سوال کرنے والا خاموش ہو کر رہ گیا۔

خروشیف نے پھر کہا: ''جس شخص نے سوال پوچھا ہے، اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے!''

یہ سوال پوچھنے والا پھر خاموش رہا۔

اس پر خروشیف نے جواب دیا: ''میں بھی اسٹالن کے ظلم و ستم کے دور میں یہی کچھ کر رہا تھا۔''

مشورہ

تحریر : ابنِ انشا

مرسلہ : محمد منیر نواز، ناظم آباد

ایک بہت ہی پیاسا کوا گرمیوں کے موسم میں پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ آخر اسے ایک جگہ پانی کا مٹکا نظر آیا۔ اس کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوا، لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پانی بہت ہی نیچے فقط مٹکے کی تہ میں تھوڑا سا ہے۔ سوال یہ تھا کہ پانی کو کیسے اوپر لائے اور اپنی چونچ تر کرلے۔ اتفاق سے اس نے حکایاتِ لقمان پڑھ رکھی تھی۔ پاس ہی بہت سے کنکر پڑے تھے، اس نے ایک ایک کنکر اس میں ڈالنا شروع کیا۔ کنکر ڈالتے ڈالتے اس کی سانس پھول گئی۔ پیاسا تو تھا ہی نڈھال ہو گیا۔ مٹکے کے اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ کنکر ہی کنکر ہیں۔ سارا پانی کنکروں نے ہی پی لیا ہے۔ بے اختیار اس کے منھ سے نکلا: ''ہت تیرے لقمان کی۔''

پھر بے سدھ ہو کر زمین پر گر گیا اور

مر گیا۔ اگر وہ کوا کسی بوتل کے اسٹال سے ایک نلکی (STRAW) لے آتا تو مٹکے کے منھ پر بیٹھا بیٹھا پانی چوس لیتا۔ اپنے دل کی مراد پالیتا، ہرگز جان سے نہ جاتا۔

فرمائش

تحریر: قدرت اللہ شہاب

مرسلہ: عامر علی، سیالکوٹ

ایک میاں بیوی بے اولاد تھے اور بچے کی آرزو لے کر حج کرنے آئے تھے۔ اپنا پہلا طواف کر کے یہ واپس آئے تو بیوی نے بڑے یقین سے کہا کہ اب ان کی مراد ضرور پوری ہو جائے گی، کیوں کہ طواف کے دوران اس نے اللہ تعالیٰ سے بچے کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگا۔

''لڑکا مانگا تھا یا صرف بچہ مانگا تھا؟'' شوہر نے بگڑ کر کہا: ''اب اللہ کی مرضی ہے چاہے تو لڑکا دے، چاہے تو لڑکی دے۔ اب وہ تجھ سے پوچھنے تھوڑی آئے گا۔ اس وقت لڑکے کی شرط لگا دیتی تو لڑکا ہی ملتا۔ یہاں کی دعا کبھی نامنظور نہیں ہوتی۔''

یہ سن کر بے چاری بیوی بھی افسوس کرنے لگی، پھر چہک کر بولی: ''کوئی بات نہیں۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔ ابھی بہت سے طواف باقی ہیں۔ اگلی بار میں اپنے خدا کو لڑکے کے لیے راضی کرلوں گی۔''

مادری زبان

تحریر: مشتاق احمد یوسفی

مرسلہ: یاسر طاہر، لاہور

ایک دانا کا قول ہے، جو تھوڑی بہت ملاوٹ کے بعد ہم تک پہنچا ہے: ''آدمی کیسا ہی ہفت زبان کیوں نہ ہو۔ گالی، گانے اور گنتی کے لیے اپنی مادری زبان ہی استعمال کرتا ہے۔

ہمارے بڑے بڑے ماہرین معاشیات اپنی رپورٹیں اور خطبات انگریزی میں لکھتے ہیں، لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں گورنر اسٹیٹ بینک بھی نوٹ اردو میں ہی گنتے ہوں گے۔''

☆☆☆

تصویر خانہ
زبیر احمد، میر پور خاص
نوریہ طالب، نواب شاہ
ماہ نور ابرار، اٹک
انعام الرحیم، ملتان
محمد اشہد انور اعوان، لاہور
ریان حسین، شہداد پور
عشال فراز، کراچی
عائشہ مہک، میر پور خاص
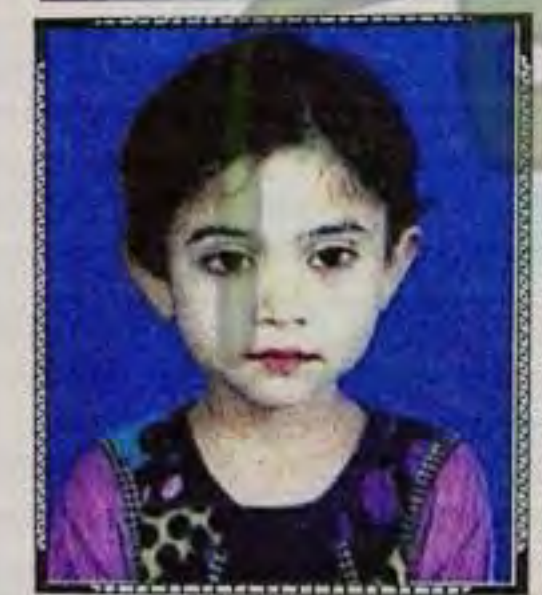
بلاعنوان انعامی کہانی

محمد فاروق دانش

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ دکھ بھری نظروں سے سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھتے رہے اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی خیالی دنیا میں کھو گئے ہوں۔ ان کی آنکھوں سے نکلنے والے قطرے میز پر گرے تو اچانک وہ سنبھل گئے۔ انھوں نے جیب سے رومال نکالا اور اپنے آنسوؤں کو صاف کرنے لگے۔

''مجھے بہت افسوس ہوا عارب صاحب کی وفات کا جان کر!'' اب وہ کچھ سنبھل چکے تھے۔

''جی! بس موت کا مزہ تو ہر ایک کو چکھنا ہے۔'' پرنسپل صاحب نے ان کی بات کے جواب میں کہا۔

وہ صاحب جو شکل وصورت اور اپنے لباس سے کوئی سرکاری افسر معلوم ہوتے تھے، بولے: ''عارب صاحب میرے بہت اچھے استاد تھے۔''

''اچھا! آپ اسی کالج میں ان کے شاگرد رہے ہیں!'' پرنسپل صاحب کو یہ بات سن کر اور خوشی ہوئی۔ پرنسپل صاحب نے ان صاحب کو کچھ دیر بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ انکار نہ کر سکے۔

پرنسپل صاحب نے چپراسی کو بلا کر چائے لینے کے لیے بھیج دیا۔

وہ پرنسپل صاحب سے کہہ رہے تھے: ''میں دراصل اپنے بچے کے داخلے کے سلسلے میں آیا تھا۔''

''جی، میں نے کلرک کو فارم لانے کے لیے کہہ دیا ہے۔''

جب کلرک فارم لے کر آیا تو انھیں سمجھانے لگا کہ اس فارم کے ساتھ کیا کیا دستاویزات لگیں گی اور یہ کہ فارم کب تک جمع کرایا جا سکتا ہے۔ اس عرصے میں پرنسپل صاحب کے پاس دو تین طالب علم اپنے کسی نہ کسی مسئلے کے سلسلے میں بات چیت کرنے کے لیے آئے اور چلے گئے۔ اسی دوران چائے بھی آ گئی۔ چپراسی نے چائے پیالیوں میں ڈال کر ان کے آگے رکھی۔ پرنسپل نیازی صاحب نے انھیں چائے لینے کے لیے کہا۔

''میں ان دنوں ایک بینک میں مینیجر ہوں۔'' انھوں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا: ''میں آج سے ۲۰ سال پہلے اس کالج کا طالب علم تھا۔'' وہ اپنی کہانی سنانے لگے تھے۔

''آپ کی طرح بہت سے طالب علم اس کالج سے ڈگریاں لے کر بڑے اہم عہدوں پر تعینات ہوئے۔'' نیازی صاحب نے سرشاری کے عالم میں کہا۔

''آپ نے درست فرمایا!'' اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ایک لمحے کو وہ پھر کسی اور خیال میں کھو گئے: ''ہماری کلاسیں دو بجے تک چلتی تھیں۔ کوئی مسئلہ نہیں سُلجھتا تھا تو ہم دیر تک بیٹھتے تھے اور اساتذہ ہمیں پیریڈ کے علاوہ بھی فاضل وقت دے کر پڑھاتے تھے۔''

''اب تو نہ پڑھنے والے رہے ہیں اور نہ پڑھانے والے!'' نیازی صاحب نے اُداسی سے کہا: ''ہم تو ترس گئے ہیں کہ کوئی ایسا ماحول بنے پڑھنے پڑھانے کا!''

''ٹھیک فرمایا آپ نے!'' آنے والے بینک افسر جن کا نام راشد عباس تھا،

بولے: ''وہ دور نہ صرف پڑھنے پڑھانے کا تھا، بلکہ لوگوں کو علم کے حصول کی طرف مائل کرنے کا بھی تھا۔''

وہ ایک بار پھر سنجیدہ ہو چکے تھے۔ اُن کی نظریں پھر عارب صاحب کی تصویر کی جانب اُٹھ گئیں۔ اُن کی آنکھوں میں کوئی پرانا منظر چل رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک تاثر آتا اور چلا جاتا۔

''میرا ایک قرض تھا عارب صاحب کی طرف!'' اچانک ان کے منھ سے الفاظ ادا ہوئے۔

''وہ کیا؟'' نیازی صاحب اچانک چونک پڑے۔

''جن دنوں میں یہاں پڑھتا تھا، فیس تو کُل ۴ رپے ماہانہ تھی، لیکن ہم شدید غربت کا شکار تھے۔'' وہ اداس لہجے میں بولے: ''میرے والد مزدوری کرتے تھے، جانے ہمارا گھر کس مشکل سے چلا رہے تھے۔''

''اوہ!'' نیازی صاحب کو ان کی کہانی سن کر افسوس ہوا، لیکن ساتھ ہی اس لمحے وہ خوشی بھی محسوس کرنے لگے کہ ایک غریب مزدور کے بیٹے نے انتہائی مشکل حالات میں اُن کے کالج سے پڑھ کر نہ صرف اچھے نمبروں سے امتحان پاس کیا بلکہ وہ معاشرے کا قابل فرد بھی بنا۔

''ایسا ہوا کہ امتحانی فارم جانے لگے۔ امتحان کی کُل فیس ۱۲ رپے تھی۔ وہ باوجود کوشش کے میں نہ ادا کر سکا اور آخری تاریخ بھی آ گئی۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رُکے۔

''پھر کیا ہوا؟'' نیازی صاحب اچانک حیران ہو گئے تھے۔

''خدشہ تھا کہ میں امتحان میں شریک نہ ہو پاتا، لیکن جناب عارب صاحب کی عظمت کو سلام! جانے کیسے وہ ہر طالب علم کے بارے میں خبر رکھتے تھے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' نیازی صاحب دوبارہ بولے۔

''عارب صاحب نے مجھے بلایا اور بولے کہ تم نے فارم کیوں جمع نہیں کرایا؟ میں نے اصل صورتِ حال بتا دی تو انھوں نے کہا کہ......''

''کیا کہا انھوں نے؟'' انھیں واقعہ سننے میں بہت دل چسپی ہو گئی، وہ اس لیے بھی ان باتوں کو دل چسپی سے سن رہے تھے کہ عارب صاحب سے کئی افراد کو مختلف شکایات تھیں اور وہ اسٹاف میں پسندیدہ آدمی نہیں سمجھے جاتے تھے۔

عارب صاحب نے کہا: ''نو پرابلم!''

''اچھا!''

''ہاں! پھر انھوں نے اپنی جیب سے امتحانی فیس کی رقم دی اور مجھے جمع کرانے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی کہا کہ جب میرے پاس رقم ہو جائے تو میں ادا کر دوں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر مغموم سے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''طالب علمی کا زمانہ شوخی کا ہوتا ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے: ''میں نے فیس لے کر فارم بھرا، امتحان دیا اور پھر وہ قرض بھول بھال گیا۔''

''ہونہہ!'' انھوں نے ایک ہنکارا ابھرا۔

''اب میرے پاس گنجائش بھی تھی اور......'' ایسا لگ رہا تھا کہ وہ عارب صاحب کی وفات کا سن کر بے حد ملول ہوئے ہیں۔

''جانے کتنے طالب علموں کی وہ مدد کرتے رہے ہوں گے۔'' راشد صاحب نے کہا۔ ''افسوس! میرا وہ قرض۔''

نیازی صاحب سوچ رہے تھے کہ عارب صاحب کے بارے میں اسٹاف کا گمان غلط تھا، جب کہ فطرتاً وہ سیدھے، سچے اور علم دوست انسان تھے۔ وہ درپردہ اپنے شاگردوں کی مدد بھی کرتے تھے اور اسٹاف ان کو بے ایمان، بے درد اور جانے کیا کیا کہتا تھا۔

''کیا ان کے گھرانے میں سے کوئی ہے جن تک میں ان کی امانت پہنچا سکوں!'' وہ چوں کہ اپنا قرض یاد کر چکے تھے، اس لیے اس کی ادائی کر کے اپنے آپ کو اس بوجھ سے آزاد کرنا چاہتے تھے۔

''نہیں، شاید ان کے گھرانے کا کوئی فرد اب اس شہر میں نہیں ہے۔''

انھوں نے کہا اور پھر نائب قاصد کے ذریعے آفس سپرینٹنڈنٹ کو بلا کر تصدیق کی۔ اُس نے بھی نفی میں گردن ہلائی کہ کوئی فرد بھی ان کے خاندان کا یہاں نہیں ہے، کسی اور شہر میں ہو تو ہو۔

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک طالب علم اپنے والد صاحب کے ساتھ پرنسپل صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی درخواست تھی۔ چپراسی نے جب اُن بزرگوار کو نیازی صاحب کی میز کے قریب کیا تو انھوں نے درخواست اُن سے لے کر پڑھی۔

درخواست پڑھنے کے بعد اُن کی گردن انکار میں ہلنا شروع ہو گئی۔ جانے اُس میں کیا لکھا تھا۔ راشد صاحب نے اس عرصے میں بھانپ لیا تھا کہ وہ بزرگوار انتہائی غریب ہیں اور شاید مزدوری کر کے اپنے گھر کی گزر بسر کرتے ہوں گے۔

''بابا! یہ رقم تو آپ کو جمع کرانا ہوگی۔'' نیازی صاحب نے درخواست ان کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

''مگر صاحب! میں ایک دم دو ہزار روپے کی رقم جمع نہیں کرا سکتا۔''

''میں مجبور ہوں بابا!'' وہ ناگواری سے بولے: ''یہ فیس کالج کی نہیں، بلکہ بورڈ کی ہے، وہ ہر صورت ادا کرنا ہوگی۔''

''مم...... مگر......'' بزرگ کے چہرے پر ایک دم مایوسی چھا گئی: ''اگر کچھ رعایت ہو جاتی تو......۔'' ان کی اُداسی اور پریشانی قابلِ دید تھی۔

''ورنہ یہ بچہ امتحان نہیں دے سکے گا۔'' وہ رو دینے والے انداز میں بولے اور وہاں سے جانے لگے۔ ایسے میں ایک آواز نے اُنھیں پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

''بابا! ٹھیریے!''

یہ آواز راشد صاحب کی تھی۔ بابا چونک کر مُڑ کے اور پلٹے۔

''جی صاحب!'' وہ حیرانی سے بولے: ''کیا آپ نے مجھے آواز دی ہے؟''

''جی ہاں!'' راشد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: ''میں نے ہی آپ کو پکارا ہے۔''

''جی فرمایئے!'' وہ قریب آ کر بولے۔

''میں نہیں چاہوں گا کہ آپ کا یہ بیٹا امتحان میں نہ بیٹھ سکے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں پایا؟'' بابا نے اُداسی سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''یہ لیجیے!'' راشد صاحب اسی دوران اپنی جیب سے پرس نکال کر ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال چکے تھے۔ یہ رقم انھوں نے بابا کی جانب بڑھائی۔

بابا ایک دم سٹ پٹا کر رہ گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایک دم سے کیا ہوگیا۔ وہ تو پرنسپل صاحب کی خدمت میں فیس کی درخواست لے کر آئے تھے، مگر وہ صاف انکار کر چکے تھے، مگر یہ شاید اللہ کی طرف سے ان کے لیے کوئی فرشتہ ہی تھا۔

بابا کے رنجیدہ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''میں کس طرح ایک انجان شخص کی مدد لوں!'' بابا نے جھجکتے ہوئے گھبراہٹ بھرے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ نوٹوں کی طرف بڑھائے۔ وہ اس وقت ملنے والی امداد کو بھلا کیسے چھوڑتے۔

''میں نہیں چاہوں گا کہ آپ کا بچہ امتحان دینے سے محروم رہ جائے۔'' یہ کہہ کر راشد صاحب نے نوٹ بابا کی مٹھی میں تھما دیے اور پرنسپل صاحب کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ میں نے عارب صاحب کا قرض واپس کر دیا ہے۔ اس طرح میرے دل و دماغ سے برسوں پرانے قرض کا بوجھ اُتر چکا تھا۔ ☆

اس بلاعنوان انعامی کہانی کا اچھا سا عنوان سوچیے اور صفحہ ۲۶۹ پر دیے ہوئے کوپن پر کہانی کا عنوان، اپنا نام اور پتا صاف صاف لکھ کر ہمیں ۱۸- جون ۲۰۱۵ء تک بھیج دیجیے۔ کوپن کو ایک کاپی سائز کاغذ پر چپکا دیں۔ اس کاغذ پر کچھ اور نہ لکھیں۔ اچھے عنوانات لکھنے والے تین نونہالوں کو انعام کے طور پر کتابیں دی جائیں گی۔ نونہال اپنا نام پتا کوپن کے علاوہ بھی علاحدہ کاغذ پر صاف صاف لکھ کر بھیجیں تاکہ ان کو انعامی کتابیں جلد روانہ کی جا سکیں۔

نوٹ: ادارۂ ہمدرد کے ملازمین اور کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔

پری کی ہمدردی

حمیرا سیّد

پیارے بچو! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ کی بہت بدصورت بیٹی پیدا ہوئی۔ بادشاہ بہت رحم دل انسان تھا۔ تمام رعایا اس سے بہت خوش رہتی تھی، مگر بادشاہ اپنی بیٹی کی پیدائش پر خوش نہیں تھا۔ دراصل کئی سالوں کے بعد اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی اور وہ بھی بدصورت۔ بادشاہ اپنی بیٹی کو گود میں لینا دور کی بات، وہ اس کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ شہزادی زیادہ تر ملکہ یا پھر کنیزوں کے پاس رہتی تھی۔

شہزادی کا رنگ سیاہ تھا۔ نقوش بھی اچھے نہیں تھے، اس لیے بادشاہ نے بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشی میں کسی کی بھی دعوت نہیں کی اور نہ کسی کو ملنے کی اجازت تھی۔ شہزادی کو دیکھنے کے لیے آنے والی تمام رعایا واپس چلی گئی، مگر ایک بوڑھی عورت ضد کرنے لگی: ''میں تو شہزادی کو دیکھے بنا نہیں جاؤں گی۔ میں تو شہزادی کو ضرور دیکھوں گی۔''

یہ دیکھ کر ایک وفادار سپاہی ملکہ کے پاس پہنچا اور بولا: ''ملکہ عالیہ! ایک بوڑھی عورت شہزادی کو دیکھنے کی ضد کر رہی ہے۔''

ملکہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ''اچھا، اس بوڑھی عورت کو چپکے سے شہزادی کے کمرے میں لے کر آ جاؤ۔ اس بات کا پتا بادشاہ کو نہ چلے۔''

''جو حکم ملکہ عالیہ!'' سپاہی نے کہا اور بوڑھی عورت کو ننھی شہزادی کے پاس لے گیا۔

جب بوڑھی عورت نے شہزادی کو دیکھا تو بولی: ''ماشاء اللہ! کتنی حسین بچی ہے۔ یہ آنکھوں کا نور ہے۔ اس کے لفظ سچے موتی جیسے ہوں گے۔ یہ ذہین ہوگی۔''

بوڑھی عورت ابھی کچھ اور بھی بولنے والی تھی کہ ملکہ نے اسے خاموش کر دیا۔ غصے سے بولی: ''تم اس طرح میری بیٹی کا مذاق نہیں اُڑا سکتیں۔ تم جا سکتی ہو۔''

یہ سُن کر بوڑھی عورت مسکرائی اور پھر جاتے جاتے شہزادی پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا۔ ملکہ پریشانی میں سوچ رہی تھی کہ بوڑھی عورت نے کیا پڑھ کر پھونکا۔ اتنے میں بادشاہ کی آواز پر وہ چونک گئی۔ جب بادشاہ کو بوڑھی عورت کی اس بات کا پتا چلا تو وہ بہت غضب ناک حالت میں کمرے میں پہنچا۔ اس نے غصے میں شہزادی کی طرف دیکھ کر کہا: ''کاش! یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ اتنی بدصورت بیٹی کا باپ بننے کے بجائے میں بے اولاد ہی رہتا۔ کم سے کم میرا مذاق تو نہ بنتا۔'' بادشاہ نے شہزادی کی طرف دیکھ کر بد دعا دی: ''خدا کرے، جوان ہونے سے پہلے اسے کوئی ایسا زخم لگے، جو اس کی جان لے کر چھوڑے۔'' یہ کہہ کر بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اپنا سر پکڑ کر رونے لگا۔ یہ سن کر ملکہ بھی غم زدہ ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اب ملکہ ہر وقت پریشان رہنے لگی۔ اس کی پرورش اور حفاظت کون کرے گا۔ اچانک اس کے ذہن میں اسی بوڑھی عورت کا خیال آیا، جو شہزادی کی خوب تعریف کر رہی تھی۔ یہ سوچ آتے ہی ملکہ نے اسی سپاہی کو بلوایا، جو بوڑھی عورت کو لے کر آیا تھا۔ ملکہ نے اسے حکم دیا کہ اس بوڑھی عورت کو ڈھونڈ کر لائے۔

دوسرے دن وہ سپاہی اسی بوڑھی عورت کو اپنے ساتھ لے کر ملکہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملکہ نے جب اس بوڑھیا کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے: ''مائی! مجھے معاف کر دو۔ میں بہت مجبور ہوں۔ میری بچی......''

ملکہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس بوڑھی عورت نے ہاتھ کے اشارے سے ملکہ کو خاموش کر دیا: ''ملکہ صاحبہ! مجھے سب معلوم ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ شہزادی کو کچھ نہیں ہوگا۔ بادشاہ سلامت کی بد دُعا ضرور پوری ہوگی، لیکن شہزادی مرے گی نہیں، بلکہ گہری نیند سو جائے گی اور کئی سالوں تک سوتی رہے گی۔ والدین کی بہت فرماں بردار ہوگی۔ شہزادی جیسے جیسے بڑی ہوگی، ویسی ہی چہرے میں بھی خوب صورتی آئے گی۔ بس آپ شہزادی کو آئینہ مت دیکھنے دیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ شہزادی پر ضرور رحم کرے گا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ جب آپ کو میری ضرورت ہو تو مجھے بُلا لینا۔''

وقت گزرتا رہا۔ آخر شہزادی پندرہ سال کی ہوگئی۔ شہزادی اپنے ملازموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتی تھی۔ ایک دن وہ محل میں گھومتے گھومتے ایک ملازمہ کے کمرے میں جا پہنچی، جو سوئی دھاگے سے کپڑے سی رہی تھی۔ شہزادی نے اس سے پہلے کبھی سوئی نہیں دیکھی تھی۔ لہٰذا وہ فوراً اس کی طرف لپکی۔ جیسے ہی اس نے سُوئی پکڑی، اس کے ہاتھ میں سوئی کے چبھنے سے زخم ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری نیند سو گئی۔ ملکہ بہت پریشان تھی۔ ملکہ نے شہزادی کے علاج کی بہت کوششیں کیں، لیکن شہزادی نیند سے بیدار نہ ہو سکی۔

اچانک ملکہ کو اسی بوڑھی مائی کا خیال آیا۔ اس نے سپاہی کو حکم دیا کہ اسے ڈھونڈ کر لائے۔

سپاہی اس نیک دل بڑھیا کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ اس نے شہزادی کے سرہانے کھڑے ہو کر ملکہ کو بتایا کہ شہزادی کو صرف اس وقت ہوش آئے گا، جب کوئی مخلص شہزادہ اس پر ترس کھائے گا۔

ملکہ شہزادی کو اس حال میں دیکھ کر بہت غم گین ہوگئی۔ بڑھیا نے ملکہ کو حوصلہ دیا کہ وقت آنے پر اللہ کے حکم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں، میں ایسا عمل پڑھوں گی، جس سے محل میں ہر شخص سو جائے گا۔ یہ کہہ کر بڑھیا نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو محل میں ہر شخص پر نیند طاری ہوگئی۔

ان سب کو سوتے ہوئے سات سال گزر گئے۔ اس دوران محل کے اردگرد جھاڑ جھنکار اُگ آیا۔ اتفاق سے ایک دن ہمسایہ ملک کا خوب صورت اور نیک سیرت شہزادہ محل کی طرف نکلا۔ جب اس نے خوب صورت مگر اجاڑ محل دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ وہ اپنی تلوار سے جھاڑیوں کو کاٹتا ہوا محل تک جا پہنچا۔

محل کے اندر دیکھا تو سب لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی۔ اس نے انھیں جگانے کی بہت کوشش کی، لیکن کوئی بھی اس کی آواز پر بیدار نہ ہوا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ وہ محل کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مکڑی کے کچھ جالے ہٹائے۔ پھر وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہوتا ہوا آخر سوئی ہوئی شہزادی کے کمرے تک جا پہنچا۔ وہ کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کی نظر سوئی ہوئی شہزادی پر پڑی۔ شہزادی اتنی معصوم و پُرکشش تھی کہ شہزادہ بے اختیار اس کو دیکھتا رہ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ یہی اس ملک کی شہزادی ہے۔ اس سے پہلے وہ بادشاہ کو اور ملکہ کو دیکھ چکا تھا۔ شہزادہ سوچ رہا تھا کہ کاش! یہ شہزادی جاگ جاتی تو میں اس سے ضرور باتیں کرتا۔ وہ شہزادی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جیسے ہی اس نے شہزادی

کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ ایک دم جاگ گئی۔ شہزادہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ شہزادی کے جاگنے سے آہستہ آہستہ محل کے سب لوگ بھی نیند سے جاگ اُٹھے۔ بعد میں شہزادے کو تمام بات بتائی گئی کہ کس طرح محل کے لوگوں پر نیند کا اثر تھا۔

بادشاہ کا دربار سجا تو ملکہ اپنے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی کو لے کر آئی۔

بادشاہ نے جب ملکہ کے ساتھ خوب صورت لڑکی دیکھی تو پوچھا: ''اتنی خوب صورت لڑکی کون ہے۔''

''حضور! یہ آپ کی نورِ نظر، آپ کی بیٹی ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد سے آج اسے دیکھ رہے ہیں۔''

بادشاہ نے جب یہ سُنا تو اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ قریب آ کر کہا: ''میری پیاری بیٹی! مجھے تم معاف کر دو۔ میں تمھیں باپ کا پیار نہیں دے سکا''

شہزادی خوشی سے اپنے باپ کے گلے لگ گئی۔

ملکہ نے کہا: ''بادشاہ سلامت! ہماری مدد ایک نیک دل بوڑھی عورت نے کی ہے۔'' پھر ایک سپاہی سے کہا: ''تم اس بڑھیا کو ہمارے پاس لے کر آؤ، تاکہ ہم بادشاہ سلامت سے اس کا تعارف کروا سکیں۔''

جب وہ بڑھیا کو دربار میں لے کر آیا تو ملکہ اور بادشاہ احترام میں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ملکہ نے بڑھیا کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔

''اے نیک دل عورت! ہم تمھارا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ تم نے ہماری بیٹی اور ہمارے محل کا بہت خیال رکھا۔'' بادشاہ نے کہا۔

''بادشاہ سلامت! یہ میرا فرض تھا۔ میں بوڑھی عورت نہیں ہوں، میں ایک پری ہوں۔''

یہ سُننا تھا کہ تمام دربار حیرت زدہ ہوگیا۔ ملکہ کی زبان سے بے اختیار نکلا:

''تم پری ہو!''

''جی ہاں ملکہ عالیہ! میں پری ہوں۔'' پھر بوڑھی عورت نے کچھ عمل پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا۔ تو وہ ایک خوب صورت پری کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ پری نے کہا: ''دراصل میں پرستان کی رہنے والی ہوں۔ ایک دن میں زمین کی سیر کو آئی تھی۔ زمین کی سیر کرتے ہوئے میں راستہ بھول گئی۔ پھر میں نے ایک بوڑھی عورت کا روپ دھار لیا۔ آپ کی رعایا نے میرا بہت خیال رکھا۔ کیوں کہ آپ بہت رحم دل اور نیک بادشاہ ہیں اور اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ نے آپ کو نیک اولاد سے نوازا ہے، مگر آپ نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اللہ سے گلہ کر دیا۔ جب کہ شکل صورت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ انسان کی سیرت، عادت اور کردار دیکھنا چاہیے۔ آپ کی بیٹی بہت فرماں بردار اور ذہین ہے۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو، مجھے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا نہ کہ شکایت۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔'' بادشاہ نے ندامت سے کہا۔

پری نے کہا: ''اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ میرا وقت پورا ہوگیا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے پَروں کو جنبش دی اور غائب ہوگئی۔

پری کے غائب ہونے کے بعد ملکہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر بولی: ''جہاں میرا ساتھ ایک پری نے دیا ہے، وہیں ایک فرشتہ صفت انسان نے بھی مدد کی ہے۔ میں اس

سے آپ سب کو ملوانا چاہتی ہوں۔‘‘

ملکہ نے سپاہی کو اپنے پاس بُلا کر کہا: ’’یہ وہ انسان ہے، جس نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ میرے ہر راز کو راز میں رکھا۔ جس طرح میں نے کہا، اس شخص نے ویسے ہی کیا۔ اگرچہ یہ بہت معمولی اور غریب انسان ہے، مگر ہم سے بہت زیادہ بلند کردار ہے۔‘‘

ملکہ نے کچھ دیر رک کر کہا: ’’پری نے ٹھیک ہی کہا تھا، انسان کی صورت کے بجائے ہمیں سیرت و کردار دیکھنا چاہیے۔ یہ سپاہی میری نظر میں ایک عظیم انسان ہے۔‘‘

تمام دربار تالیوں سے گونج اُٹھا۔ بادشاہ نے سپاہی کو کافی انعام واکرام سے نوازا۔ پھر بادشاہ نے بیٹی کی شادی شہزادے سے کردی۔ شہزادہ، شہزادی کو اپنے ملک لے گیا۔ پھر سے بادشاہ کی سلطنت میں سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ☆

تصویر کی تعبیر

جدون ادیب

صائمہ پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس بستی کے اکثر لوگوں کی طرح اس کا تعلق بھی انتہائی غریب گھرانے سے تھا۔ ایک سماجی ادارے نے بستی کے دو اسکولوں میں بڑی تعداد میں مفت داخلے کروائے تھے۔ ان بچوں کو کتابیں اور یونی فارم مفت ملتا تھا اور اسکول کی فیس ادارہ دیتا تھا۔ اس اسکیم کی وجہ سے بہت سے ایسے بچے بھی پڑھنے لگے، جو عام حالات میں پڑھنے سے قاصر تھے۔

صائمہ کے والد کباڑ کا کام کرتے تھے۔ یہ بستی ایک پہاڑ اور اس سے ملحقہ نیم ہموار زمین پر مکانات پر پھیلی ہوئی تھی۔ پہاڑ کاٹ کر بھی پلاٹ بنائے گئے تھے۔ وہاں سستا پلاٹ مل جاتا تھا۔ زیادہ غریب لوگوں نے وہاں گھر بنا رکھے تھے۔ صائمہ کا گھر بھی پہاڑ پر واقع تھا۔ اس کے والد پیدل گھوم کر کباڑ، کاغذ، لوہا اور باسی روٹی جمع کرتے تھے اور سخت محنت کے بعد اتنا کمانے میں کام یاب ہوتے کہ مشکل سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ صائمہ کے علاوہ ان کے چار بچے اور تھے۔ دو بیٹیوں کی وہ شادی کر چکے تھے۔ صائمہ سے بڑا اس کا بھائی ایک گیراج میں کام سیکھ رہا تھا۔ بدقسمتی سے وہ پڑھ نہیں سکا تھا۔ صائمہ سے پانچ سال چھوٹا اس کا بھائی ندیم مدرسے میں پڑھتا تھا۔ صائمہ نے اپنے اسکول میں اس کے داخلے کے لیے بات کر رکھی تھی اور اس مقصد کے لیے وہ اُسے گھر پر پڑھاتی بھی تھی۔

امتحانات قریب تھے۔ اعلان ہوا کہ اگلے ہفتے ناظرہ اور دست کاری کا امتحان ہوگا اور باقاعدہ امتحان دوسرے ہفتے سے شروع ہوں گے۔

دستکاری کے لیے بچوں کو اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی چیزیں لانے کو کہا جاتا ہے، مگر

بچے بازار سے شوپیس خرید کر جمع کرا دیتے تھے۔ بہت سے بچے پھول اور پودے خرید لاتے۔ مس فاطمہ نے اس اسکول میں پچھلے سال انھی دنوں میں پڑھانا شروع کیا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ بچے دانستہ مہنگے شوپیس لائے ہیں، تاکہ زیادہ نمبر ملیں۔ بچوں نے پیسوں کے لیے غریب والدین کو تنگ بھی کیا اور وہ شکایت بھی لے کر آئے، مگر امتحان کے بعد وہ شوپیس میڈم اپنے گھر لے گئیں، کچھ چوکیدار اور ماسی لے گئے۔ ٹیچرز اور اسٹاف کو بھی کچھ تحفے مل گئے۔

مس فاطمہ نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اگلے سال وہ اس عمل کو تعمیری انداز میں کرنے کی کوشش کریں گی۔ انھوں نے میڈم سے کہا کہ بچے اپنی حیثیت سے بڑھ کر وہ چیزیں لاتے ہیں، جو اسکول کے کام نہیں آتیں۔ کچھ بچے معمولی چیزیں لاتے ہیں، وہ بھی بے کار ہوتی ہیں تو کیوں نہ بچے ایک مقررہ پیسے مثلاً پچاس روپے جمع کرائیں اور اس رقم سے اسکول کی ضروریات کی چیزیں لے لیں یا کسی کام میں وہ پیسے صرف کر دیں۔

میڈم نے ان کی بات مان لی اور انھیں ہی اس پروگرام کا انچارج بنا دیا۔

پچھلی مرتبہ کسی بچے نے اپنے گھر والوں کے دو سو روپے سے کم خرچ نہیں کروائے تھے۔ اس مرتبہ اسکول میں پچاس رُپے جمع کرانے کو کہا گیا تو سب نے ہنسی خوشی پیسے دے دیے۔ صائمہ نے پیسے جمع نہیں کرائے، کیوں کہ وہ اپنے ابو سے پچاس رُپے بھی نہیں مانگ سکتی تھی۔ وہ بہت بوڑھے اور کم زور تھے۔ ایک ایک رُپے کی بچت کرتے تھے۔ اس نے آخر میں مس فاطمہ کو بتا دیا کہ وہ پیسے نہیں دے سکتی۔ مس فاطمہ نے اسے کہا کہ وہ اچھی سی ڈرائنگ بنا کر لائے، کیوں کہ اس کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔

''میں اس ڈرائنگ کو پلاسٹک کوٹنگ کروا دوں گی۔ تب وہ اچھی لگے گی اور تم پیپر

میں نمبر لے سکو گی۔'' انھوں نے صائمہ کو سمجھایا۔

''میں ایسا ہی کروں گی مس!'' صائمہ نے خوش ہو کر کہا۔

پھر اس نے رات کو دیر تک جاگ کر اپنے اسکول کی تصویر بنائی۔ اسکول کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ صحن کا فرش ٹوٹ چکا تھا۔ دروازے کھڑکیاں مرمت طلب تھے۔ رنگ و روغن برسوں سے نہیں ہوا تھا۔ تختہ سیاہ بھی خراب ہو چکے تھے۔ مگر صائمہ نے اپنے اسکول کی تصویر میں خوب صورتیاں بھر دیں۔ فرش میں اس نے ٹائلیں دکھائیں۔ اندرونی دیواروں میں کارٹون بنائے۔ ٹھنڈے پانی کی مشین بنائی۔ میڈم کے آفس میں اس نے میز پر کمپیوٹر اور دیوار پر ٹی وی بنایا۔ اس نے عبادت والے کمرے میں بچوں کو چاشت کی نماز پڑھتے دکھایا۔ کمرے کی گھڑی پر صبح کے ۹ بج رہے تھے۔

مس فاطمہ نے تصویر کو دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ واقعی بہت خوب صورت تصویر تھی۔ جب تصویر فریم ہو کر آئی تو کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ مس فاطمہ نے دوسرے بچوں کو ۴۵ اور صائمہ کو پورے ۵۰ نمبر دیے۔ میڈم نے تصویر آفس میں آویزاں کر دی۔ دوسرے دن اسمبلی میں میڈم نے صائمہ کی تصویر کی تعریف کی اور اسے اپنی جیب سے سو روپے انعام دینے کا اعلان کیا۔

صائمہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی اتنی زیادہ ہمت افزائی ہو گی اور میڈم سمیت تمام اسٹاف حیران تھا کہ اتنی چھوٹی سی بچی اور اتنی خوب صورت ڈرائنگ۔

ادارے کے آفیسر بچوں کے امتحانات کا جائزہ لینے کے لیے آئے تو وہ بھی تصویر دیکھ کر حیران ہوئے۔ جب انھوں نے صائمہ کو دیکھا تو اور بھی حیران ہوئے۔ وہ بہت دیر کچھ سوچتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنے اسٹاف کو اسکول کی مختلف زاویوں سے تصاویر

بنانے کو کہا اور میڈم سے صائمہ کی بنائی ہوئی تصویر مانگ کر لے گئے۔ کچھ دن بعد امتحانات شروع ہو گئے۔ امتحان کے بعد رزلٹ کا دن آیا۔ اس دن اسکول میں فنکشن تھا۔ صائمہ نے بہت محنت کی تھی، مگر وہ حفصہ اور مقدس سے نہ جیت سکی، مگر تیسری پوزیشن بھی غنیمت تھی۔ حفصہ اور مقدس ٹیوشن بھی پڑھتی تھیں، ان کے ٹیسٹ میں بھی نمبر زیادہ آتے تھے۔

رزلٹ کے بعد عام طور پر دس دن کی چھٹیاں ملتی تھیں، مگر اس مرتبہ پندرہ دن کی چھٹی ملی۔ اسکول جب کھلا تو بچے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسکول کا تو حلیہ ہی بدلا ہوا ہے۔ ہر چیز اس طرح تھی، جیسے صائمہ نے تصویر میں بنائی تھی۔ صائمہ حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھ رہی تھی، پھر اسے کوئی خیال آیا تو وہ چونکی اور پھر سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔ وہ عبادت کے کمرے کے سامنے پہنچی تو اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ گھڑی ویسی ہی تھی، جیسی صائمہ نے تصویر میں بنائی تھی۔ اس وقت گھڑی پر ساڑھے سات بج رہے تھے۔ صائمہ عجیب سی کیفیت میں گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے جوتے اُتارے اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ فجر کی نماز پڑھ چکی تھی اور وضو میں تھی۔ اس نے اشراق کی نماز کی نیت کر لی۔

دعا مانگ کر وہ کمرے سے باہر آئی تو اس کے دائیں طرف لگے اسپیکر سے میڈم کی آواز گونجی: ''صائمہ! خوش آمدید بیٹا! مجھے تمھیں نماز پڑھتے دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔''

صائمہ نے چونک کر دیوار میں نصب اسپیکر کی طرف دیکھا۔ میڈم کی آواز گونجی: ''اسپیکر کے اوپر کیمرہ نصب ہے۔ میں تمھیں دیکھ رہی ہوں۔ عبادت کے کمرے کی تزئین کے بعد وہاں سب سے پہلے تمھیں سجدۂ شکر کا موقع ملا۔ یہ بھی انصاف کی بات

ہے۔ تم سیدھی آفس میں پہنچو!''

صائمہ سحرزدہ انداز میں سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اب بچے زیادہ جمع ہو گئے تھے۔ ہر کوئی خوش تھا۔ میڈم نے آفس کے دروازے پر آ کر صائمہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر لے گئیں اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا۔

میڈم کا کمرا خوب صورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ ان کی میز پر کمپیوٹر موجود تھا اور سامنے دیوار پر سی ٹی وی کے ذریعے سے پورے اسکول کا منظر نظر آ رہا تھا۔

آفس میں موجود سب لوگ میڈم کی طرف متوجہ تھے۔ بے چینی سے وہ میڈم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر وہ بولیں: ''آپ سب کے علم میں ہے کہ صائمہ نے اسکول کی ایک تصوراتی تصویر بنائی۔ کم از کم میں تو یہی کہوں گی۔''

وہ ذرا رکیں اور بولیں: ''ہمارے سرپرست اسکول میں آئے۔ انھوں نے صائمہ کی تصویر دیکھی اور پسند کی۔ ہماری کئی میٹنگ ہوئیں۔ ہم نے ایک نئی فائل بنائی۔ اس کا نام تھا ''صائمہ کا خواب اور اس کی تعبیر'' ہم نے یہ لکھا کہ صرف بچوں کی فیس اور تعلیمی ضروریات پوری کر کے یہ سمجھنا کہ ذمے داری پوری ہو گئی، یہ تصور درست نہیں۔ بچوں کو بہتر ماحول اور صاف پانی بھی ملنا چاہیے۔ ایجوکیشن کو خوش گوار ہونا چاہیے۔ تب ہمارے سرپرست اس بات پر تیار ہوئے کہ وہ اپنے زیرِ نگرانی تمام اسکولوں میں بہتر سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنائیں گے اور ہمارے اسکول کو خاص طور پر اضافی سہولیات دیں گے، تاکہ صائمہ کا خواب پورا ہو۔ یہ ایک سرپرائز تھا۔ اسٹاف کے کچھ افراد کے علاوہ کسی کو اس پروجیکٹ کا علم نہ تھا۔ چوں کہ صائمہ نے ڈونرز کو ایک نئی اور تعمیری سوچ دی اور اس کی وجہ سے اس ادارے سے منسلک بہت سے بچوں کو فائدہ ہوا، لہٰذا صائمہ کے لیے انھوں نے

اس آئیڈیا کی قیمت (رائلٹی) کے نام پر ایک ماہوار رقم مقرر کی ہے اور ہمیں وہ سب سہولیات فراہم کردیں، جن کو حاصل کرنے میں شاید ہمیں برسوں لگ جاتے۔''

میڈم خاموش ہوئیں تو سب حیرت اور تحسین کے انداز میں صائمہ کی طرف دیکھنے لگے، جو خود حیران پریشان تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

میڈم بولیں: ''آپ لوگ کنجوس بہت ہیں۔ صائمہ کے لیے تالیاں ہونی چاہییں۔''

سب صائمہ کے لیے تالیاں بجانے لگے۔ مس مہرین بولیں: ''کنجوسی سے یاد آیا کہ کوئی دعوت یا خاص اہتمام ہونا چاہیے!''

''آج زبردست دعوت ہوگی۔'' میڈم نے خوش خبری سنائی، پھر صائمہ کا ہاتھ پکڑ کر بولیں: ''مجھے امید ہے کہ تم دوسری بچیوں کے لیے ایک مثال بنو گی۔ درحقیقت تم ہمارا فخر ہو۔ اس اسکول کی محسن ہو!''

پھر انھوں نے پوچھا: ''تم جانتی ہو، تمھیں ہر ماہ کتنی رقم ملے گی؟''

صائمہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر الفاظ لبوں تک آ کر دم توڑ گئے۔

میڈم نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا: ''اس سال تمھیں پانچ ہزار روپے ماہوار ملیں گے۔ پھر ہر جماعت کے بعد ایک ہزار بڑھ جائیں گے۔ یہ معاہدہ بارہ سال کے لیے ہے۔ اب تم ایم اے، ڈبل ایم اے سب کچھ کر سکو گی!'' وہ ایک لمحہ رک کر پھر بولیں: ''اور اس کے علاوہ میری طرف سے دس ہزار روپے آج ہی گھر لے جانا۔ تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

''نہیں!'' صائمہ نے آہستہ سے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا: ''مجھے رونا آرہا ہے!''

میڈم نے اسے اپنے کاندھے سے لگا لیا اور وہ رونے لگی۔ خدا کے لیے اُس کے پاس یہی شکرانہ تھا۔

☆

آیئے مصوری سیکھیں

غزالہ امام

ڈرائنگ بنانے کا ایک طریقہ ''STICK'' ڈرائنگ کہلاتا ہے۔ یہ بہت آسان ہے۔ اس میں صرف آڑی سیدھی لائنوں اور دائروں سے کام لیا جاتا ہے۔ تصویر میں دکھائے گئے نمونوں کی مدد سے آپ اپنی پسند کے مطابق بہت سے کارٹون بنا کر اس میں مختلف رنگ بھر سکتے ہیں۔

☆

سمیہ وسیم، سکھر

عبدالمتین علی رضا، کراچی

کومل فاطمہ اللہ بخش، لیاری

محمد حمزہ قادری، حیدر آباد

انعم فاطمہ، راولپنڈی

اقصیٰ ضمیر، ٹانک

فلک ناز رضا محمد، کراچی

فاکہہ یمنیٰ صدیقی، کراچی

طوبیٰ فاروق حسین شیخ، شکارپور

زنیرا سلیم، حیدرآباد

عرشیہ نوید، کراچی

سیدہ رامین عظام، ناظم آباد

ثبات زہرا، حسن ابدال

پاکیزہ حسین، حیدرآباد

میرا بھائی

وہ لندن میں میرے گھر کے دروازے پر ایک احمقانہ مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اس توقع کا اظہار ہو رہا تھا کہ میں اُسے دیکھتے ہی پہچان لوں گا اور یوں لپک کر اپنے سینے سے چمٹا لوں گا، جیسے وہ میرا بچپن کا بچھڑا ہوا بھائی ہو۔ اس کا اندازہ تو مجھے فوراً ہو گیا کہ وہ ضرور میرے آبائی قصبے ہڈالی (خوشاب) سے آیا تھا۔ جہاں میرا بچپن گزرا تھا اور جہاں میرا آبائی گھر تھا۔ وہ جوش و خروش سے بولا: ''میں اپنے بڑے بھائی کو تلاش کرنے اتنی دور آیا ہوں اور اسے گھر واپس لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ یہیں رہتے ہیں۔''

''کون بھائی...... اور تم کون ہو...... کہاں سے آئے ہو؟''

''میرا نام ارسلان ہے۔ میرے بھائی آشیان جو یہاں ایک بڑے بزنس مین کے طور پر مشہور ہو چکے ہیں۔''

''یہاں لندن میں...... بڑے بزنس مین......؟'' اس نے مجھے اُلجھا دیا تھا۔

''جی ہاں یہ وقت، وقت کی بات ہے۔ انسان کیا سے کیا بن جاتا ہے...... جیسے آپ بھائی جان!''

وہ بولے چلا جا رہا تھا اور میں مسلسل اسے گھور رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں واقعی وہ میرا بھائی نہ ہو۔ مجھے پاکستان سے رخصت ہوئے تقریباً تیس برس گزر چکے تھے۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کوئی شخص میرا بھائی ہونے کا دعوا کر رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ مجھ سے چھوٹی صرف ایک بہن تھی۔ وہاں کے حالات سے تنگ آ کر میں آگے بڑھنے، دولت، شہرت کمانے کے خیال سے لندن آ پہنچا تھا۔ میری ماں نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ ہمیں اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تمھارے بغیر ہم تنہا رہ جائیں گے۔ ایک تم ہی تو ہو جو بڑھاپے میں ہمارا سہارا بنو گے، مگر میں سب کی سنی اَن سنی کرتا ہوا یہاں چلا آیا۔ یہ سوچ کر کہ کچھ برس گزار کر لوٹ جاؤں گا، مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میری عمر کا بڑا حصہ یہیں بیت جائے گا۔ اب میں لندن کا شہری ہوں۔ یہاں میرے خوابوں کی تکمیل ہو چکی ہے۔ دولت کے ساتھ ساتھ بیوی بچے بھی ہیں۔ یہاں آ کر میں اتنا مصروف ہو گیا کہ واپسی کا خیال دل سے نکل گیا۔

میں نے اسے پہچاننے کی بہت کوشش کی، لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس

میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ہڈالی سے آیا تھا۔ اس کے انداز و اطوار بتا رہے تھے کہ وہ میرے ہی قصبے سے آیا تھا، لیکن وہ کون تھا؟ یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کی آواز، اس کا نام، اس کا لہجہ کچھ بھی شناسا نہیں لگ رہا تھا، لیکن اس وقت میں اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتا تھا، کیوں کہ کچھ دن پہلے ہی مجھے لندن چھوڑنے کا نوٹس ملا تھا اور یہ سب کچھ سات جولائی کو لندن میں ہونے والے بم دھماکوں کی وجہ سے تھا۔ نوٹس میں لکھا تھا کہ آپ پر الزام ہے کہ آپ یہاں پاکستانی دہشت گردوں کو پناہ دیتے ہیں، ان کی مالی امداد کرتے ہیں، لہٰذا آپ کو اس الزام کے تحت فوراً یہ ملک چھوڑنا ہوگا۔ دوسری صورت میں آپ کے تمام اثاثے منجمد کر دیے جائیں گے اور آپ سے برطانوی شہریت چھین کر حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔

مجھے یقین تھا کہ میں اپنے تعلقات کی بنا پر اس الزام سے بری ہو جاؤں گا۔ اس سلسلے میں کئی لوگوں سے بات بھی کی تھی، مگر وقتی طور پر یہ نوٹس پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ اگر میں نے یہ ملک نہ چھوڑا تو میری شہریت منسوخ ہونے کا ڈر تھا اور میری ساری زندگی کا سرمایہ چند دنوں میں ملیامیٹ ہو سکتا تھا اور تو اور اس نوٹس کی وجہ سے میری انگریز بیوی بھی مجھے پاکستانی تخریب کار کا طعنہ دے کر اپنے ماں باپ کے گھر جا چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ ادھر وہ نوجوان جو خود کو میرا بھائی بتا رہا تھا، خاموش کھڑا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

''تم کون ہو اور خود کو میرا بھائی کیسے کہہ سکتے ہو؟ میں تو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا: ''بھائی جان! آپ واقعی اکلوتے بیٹے تھے اور اکلوتے ہی ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد امی ابو نے مجھے گود لیا تھا۔ تب میں صرف ڈیڑھ سال کا تھا۔ انھوں نے اپنے سگے بیٹے کی طرح میری پرورش کی۔ ان کا خیال تھا کہ میں بڑھاپے میں ان کا سہارا بنوں گا۔ میں نے ان کی خواہشات کو ان کا حکم اور اپنا فرض سمجھ کر پورا کرنے کی کوشش کی، مگر مجھے ہر وقت ان کی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا۔ یوں لگتا جیسے کہیں کوئی کمی ہے، جو پوری نہیں ہو پا رہی۔ میں نے اپنی محبت اور خدمت سے اس خلا کو پُر کرنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ خلا جوں کا توں رہا۔ آخر ایک رات مجھے اس کا سبب معلوم ہو گیا۔

ایک رات میں نے امی کے رونے کی آواز سنی۔ میں اُٹھ کر ان کے کمرے میں پہنچا

تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تسبیح ہاتھ میں لیے خدا کے حضور رو رو کر اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ میں خوشی سے سرشار ہو گیا کہ میری ماں کتنی عظیم اور مہربان ہے، جو رات کے اس پہر میرے لیے دعائیں کر رہی ہے، مگر اچانک یہ سن کر میں حیران رہ گیا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے آشیان کے لیے دعا کر رہی تھیں۔ جس کے لیے رو رو کر ان کی آنکھیں سرخ اور دوپٹا آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے اُڑ گئی ہے۔ یہ سوچ کر کہ میرا بڑا بھائی بھی ہے۔ میں تو آج تک خود کو اکلوتا سمجھتا رہا۔ میرا بڑا بھائی کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ یہ سوالات مجھے پاگل کیے جا رہے تھے۔ اس سوچ میں صبح ہو گئی۔ صبح ہوتے ہی میں نے ماں سے اپنے سوالوں کے جواب مانگے۔ ماں نے پہلے تو مجھے بڑے پیار سے ٹال دیا۔ میرے ضد کرنے پر انھوں نے ساری بات بتا دی۔ ان کا خیال تھا کہ آپ واپس آ جائیں گے تو ان کے دو بیٹے ہو جائیں گے۔ دونوں بڑھاپے میں ان کا سہارا بنیں گے، مگر آپ نہیں آئے۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے دل میں ٹھان لی کہ میں آپ کو ضرور تلاش کروں گا اور واپس امی ابو کے پاس لے جاؤں گا۔ آپ کے انتظار میں وہ دونوں بوڑھے ہو گئے۔ اب زندگی کے آخری دنوں میں انھیں آپ کی ضرورت ہے۔ وہ باقی زندگی آپ کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں...... بھیا! خدا کے لیے...... آپ واپس چلیں بھیا! گھر چلیں...... اپنے امی ابو کے گھر۔''

اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے ماں باپ، اپنے لوگ، اپنے بچپن اور

اپنے گھر کی یاد آنے لگی۔ اپنا دیس ایک دم میری آنکھوں کے سامنے آ گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ان کٹھن حالات میں جن سے میں گزر رہا تھا، کوئی تو اپنا ملا، جس کے کندھے پر سر رکھ کر میں رو سکتا تھا، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا تھا۔ میرے بیوی بچے تو نوٹس ملتے ہی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ میں کش مکش میں پڑ گیا۔ ارسلان کی باتیں سن کر ایک طرف ماں باپ اور سوہنی دھرتی یاد آنے لگی۔

''پلیز آشیان بھائی! آپ ہمیشہ کے لیے نہ سہی، ایک بار تو ضرور گھر چلیں۔ میرے لیے نہ سہی، اس ماں کے لیے چلیں، جس نے آپ کے انتظار میں رو رو کر اپنی آنکھوں کی بینائی ختم کر لی ہے، اس باپ کے لیے چلیں، جس کے بوڑھے کندھوں کو آپ کے مضبوط بازوؤں کی ضرورت ہے۔''

اسی وقت میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف خفیہ پولیس کا انسپکٹر تھا، جو کہہ رہا تھا کہ آپ پر لگے تمام الزامات مسترد کیے جاتے ہیں۔ آپ ایک پُر امن مہذب شہری ہیں۔ آپ کی شہریت بھی محفوظ ہے، لہٰذا آپ پریشان نہ ہوں اور تخریب کاروں سے نمٹنے کے لیے ہم سے تعاون کریں، شکریہ۔''

میرے اثر و رسوخ نے کام کر دکھایا تھا اور میں بے گناہ ثابت ہو چکا تھا، لیکن مجھے یوں لگا کہ یہ سب میری ماں کی دعاؤں کا صلہ ہے، جو زندگی بھر میرے ساتھ رہیں۔ میں نے ارسلان کو گلے لگا کر بھینچ لیا۔

چند دن کے اندر میں نے تمام کاروبار فروخت کر کے سرمایہ اپنے وطن بھیج دیا اور ارسلان کو لے کر ہمیشہ کے لیے اپنے آبائی گھر کی طرف چل پڑا۔ ☆

مہروز
اقبال

مسعود احمد برکاتی

جن کی بے نور آنکھوں نے علم کی روشنی پھیلائی

خورشید زماں، جھانسی کے ایک تاجر تھے۔ ان کے ہاں ۱۹۴۳ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام اقبال احمد رکھا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں یہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا اور کراچی میں قیام کیا۔ یہاں اقبال احمد کی تعلیم کا آغاز ہوا، لیکن اقبال ابھی دس سال کے ہی ہوئے تھے کہ آنکھوں میں کالا پانی اُتر آیا، آنکھیں ضائع ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کی دنیا اندھیری ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ لوگوں نے سوچا کہ اب تو یہ

دس سالہ ہونہار لڑکا بینائی کے ساتھ ساتھ تعلیم سے بھی محروم ہو جائے گا، لیکن عزم و ہمت کی طاقت آنکھوں سے بھی بڑی نعمت ہے۔ شاید سب سے بڑی نعمت۔ اقبال نے پڑھنا لکھنا نہیں چھوڑا۔ کیا نابینا پڑھ لکھ نہیں سکتے۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ آنکھیں چھن جانے کے باوجود تعلیم حاصل کی اور اعلا تعلیم حاصل کی۔ مصر کے طٰہٰ حسین اور ہیلن کیلر کی مثالیں تو حال ہی کی ہیں، جنھوں نے دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

اقبال نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ تعلیم جاری رکھی۔ پرائیویٹ پڑھتے رہے اور امتحان دیتے رہے۔ ۱۹۶۵ء میں "فاضل اردو" کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۷۱ء میں سی۔ ٹی کا۔ ۱۹۷۲ء میں ایم اے کے امتحان میں کام یابی حاصل کی۔

سی۔ ٹی میں جب اقبال نے داخلہ لینا چاہا تو نابینا ہونے کی بنا پر داخلہ نہیں دیا جا رہا تھا، لیکن اقبال کی خواہش اور کوشش کے بعد اس شرط پر ان کو کلاس میں بیٹھنے دیا گیا کہ اگر کارکردگی اچھی رہی تو باقاعدہ داخلہ دے دیا جائے گا، ورنہ امتحان میں شریک نہیں کیا جائے گا، لیکن تین ماہ میں اقبال نے اپنی محنت اور شوق سے پرنسپل صاحب کو قائل کر دیا اور باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے سینٹ پیٹرک ٹیچرس ٹریننگ کالج سے سی ٹی کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۷۳ء تک کالج آف ایجوکیشن میں نابیناؤں کو داخلہ نہیں دیا جاتا تھا۔ گویا ان کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن اقبال نے وہاں اپنا سی ٹی کا ریکارڈ دکھا کر نہ صرف خود داخلہ لیا، بلکہ ان کی مثال قائم ہونے کے بعد وہاں نابیناؤں کے داخلے پر پابندی بھی ختم ہو گئی۔ اس کالج سے اقبال نے ۱۹۷۴ء میں بی۔ ایڈ کا امتحان پاس کیا۔

تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال تعلیم دیتے بھی رہے۔ ۱۹۶۳ء میں

''آئیڈا ریو (IDA RIEU) اسکول برائے نابینا'' میں استاد مقرر ہوئے۔ اپنی اچھی کارکردگی اور مستقل مزاجی کی بنا پر ۶۹ء میں ان کو اسی اسکول کا ٹیچر انچارج بنا دیا گیا۔ اب ۱۹۷۹ء سے ایس۔ ایم آرٹس کالج، کراچی میں لکچرر کی حیثیت سے تاریخ پڑھا رہے ہیں۔

اقبال احمد صاحب کو اسکول کے زمانے ہی سے لکھنے کا بھی شوق ہے۔ ۶۸ء میں ان کی پہلی کہانی ریڈیو سے نشر ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں ماہ نامہ ہمدرد نونہال میں ان کا پہلا مضمون ''چمگادڑ'' کے نام سے چھپا اور اس کے بعد سے آپ ہمدرد نونہال میں کبھی کبھی ان کی کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ کراچی کے ایک اور ناشر نے بھی اقبال صاحب کی کہانیاں چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں چھاپیں۔

اقبال احمد صاحب نے مہروز اقبال کے نام سے اخبار ڈان اور مارننگ نیوز میں انگریزی میں بھی کہانیاں لکھی ہیں، جن کی تعداد اسی کے قریب ہے۔ اردو میں ایک چھوٹی سی کہانی کی کتاب ''خوف ناک بڑھیا'' کے نام سے خود بھی شائع کی ہے۔ اس پر بھی ان کا قلمی نام مہروز اقبال ہی لکھا ہے اور آیندہ اردو، انگریزی دونوں میں ان کا قلمی نام مہروز اقبال ہی رہے گا۔

نابیناؤں کی تعلیم کے لیے اُبھرے ہوئے نقطے حروف کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اُن کو بریل (BRAILLE) کہتے ہیں، کیوں کہ یہ طریقہ لوئی بریل نامی ایک فرانسیسی نابینا نے ۱۸۲۹ء میں ایجاد کیا تھا۔ اقبال صاحب نے قرآن مجید کے مکمل انگریزی ترجمہ کو بریل کے حروف میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ انگریزی ترجمہ علامہ عبداللہ یوسف علی کا ہے اور بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ کام ''حاتم علوی میموریل لائبریری'' نے اقبال صاحب سے کروایا ہے۔ اس میں دو سال صرف ہوئے ہیں اور یہ دو ہزار صفحات میں آیا ہے اور

اب یہ ترجمہ بریل میں چھپ بھی گیا ہے اور بیرونی ملکوں کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس کام میں اقبال صاحب کی چھوٹی بہن فریدہ خورشید نے ان کی بڑی مدد کی ہے اور وہ اقبال صاحب کے ہر کام میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ فریدہ کے علاوہ اقبال صاحب کی ایک بہن اور دو بھائی اور ہیں۔ یہ سب اللہ کے فضل سے آنکھوں والے ہیں۔ قرآن پاک کے انگریزی ترجمے کے علاوہ حاتم علوی میموریل لائبریری کے لیے اقبال صاحب نے اردو کی آٹھ دس کتابیں بھی بریل میں منتقل کی ہیں۔

مہروز اقبال صاحب کو تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی خاص دل چسپی ہے۔ وہ اردو کے ناول افسانے بھی شوق سے پڑھتے ہیں اور خالی وقت میں ریڈیو کے تعلیمی اور معلوماتی پروگرام سنتے ہیں۔

یہ ہے ایک دس سالہ لڑکے کے عزم و ہمت کی کہانی، جو بصارت سے محروم ہو گیا، لیکن جس نے بصیرت سے کام لے کر آنکھوں والوں کو سبق دیا ہے۔ اگر انسان کسی ایک نعمت سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی دوسری صلاحیتوں کو ترقی دے سکتا ہے۔ انسان کو کسی حال میں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یقین، ہمت اور محنت سے ہر مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے اور بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک میرا یہ مضمون ہمدرد نونہال جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا، جب مہروز اقبال حیات تھے۔ ۲۴ فروری ۲۰۰۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اقبال صاحب نے اپنے بچوں کو خوب تعلیم دی۔ ان کی صاحبزادی مہوش اقبال ماشاء اللہ بینائی کی نعمت سے مالا مال ہیں اور ایک اعلا درجے کے اسکول میں اُستاد ہیں۔ میں آیندہ ان کی تحریریں بھی شائع کروں گا۔ ☆

صبر کا مہینا

نسرین شاہین

روزہ دینِ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ رمضان المبارک کے پورے روزے رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اس ماہِ مبارک میں جو مسلمان کوئی نیک عمل کرتا ہے، اس کا اجروثواب اسے دیگر مہینوں کے مقابلے میں زیادہ ملتا ہے۔ جو شخص اس ماہِ مبارک میں ایک فرض ادا کرتا ہے تو اس کو ۷۰ فرضوں کا ثواب ملتا ہے۔ رمضان رحمتوں، برکتوں، سعادتوں اور رحمتوں کا مہینا ہے۔

روزے ۲ ہجری (۶۲۴ عیسوی) میں فرض ہوئے۔ روزہ وہ عبادت ہے، جو پہلی اُمتوں پر بھی فرض تھی۔ اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی چند مخصوص ایام میں روزے رکھا کرتے تھے۔ قدیم مصری باشندے بھی روزوں سے واقف تھے۔

رمضان المبارک قمری سال کا نواں مہینا ہے۔ رمضان المبارک میں تین عشرے ہیں۔ پہلا عشرہ رحمت، دوسرا عشرہ مغفرت اور تیسرا عشرہ جہنم سے نجات کا ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں آٹھ دروازے ہیں، جن میں ایک کا نام ریان ہے۔ اس سے صرف روزے دار ہی داخل ہوں گے۔''

ایک جگہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''رمضان کا مہینا صبر کا مہینا ہے اور بے شک صبر کرنے والوں کو ہی اس کا ثواب ملتا ہے۔''

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: ''ماہِ رمضان غم خواری کا مہینا ہے۔ اس میں اہلِ ایمان کی روزی میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔''

روزے دار کے لیے فرشتے افطار تک دعاے مغفرت کرتے ہیں۔ رمضان المبارک کے تیسرے عشرے کی طاق راتوں میں سے ایک رات ایسی ہوتی ہے جو شب قدر کہلاتی ہے۔ یہ ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ یا ۲۹ ویں رات ہو سکتی ہے۔ عام طور پر رمضان کی ستائیس ویں شب کو شبِ قدر کہا جاتا ہے۔ یہ اتنی بابرکت رات ہے کہ قرآن نے اسے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے۔ پاکستان بھی رمضان کی ۲۷ ویں شب میں آزاد ہوا۔

قرآن مجید کے نزول کا آغاز رمضان المبارک میں ہوا، جو دنیا کے تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہے۔ قرآن پاک حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے اُترا۔ پورا قرآن مجید ۲۳ سال ۵ ماہ اور ۱۴ دن میں نازل ہوا۔ قرآن ہمیں زندگی گزارنے کا سیدھا اور سچا راستہ بتاتا ہے۔ قرآن مجید پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

جو بچے روزے رکھتے ہیں، وہ یقیناً روزے کی معنی سے بھی واقف ہوں گے۔ روزے کو عربی میں صوم کہتے ہیں اور صوم کے معنی ہیں رکنا، یعنی شریعت کے اعتبار سے نہ صرف بھوک پیاس کو روک لینا بلکہ تمام بُرائیوں سے اپنے آپ کو روکے رکھنا اور بچائے رکھنا۔ جھوٹ، غیبت، چغل خوری اور حسد وغیرہ سے تو عام دنوں میں بھی بچنا چاہیے، مگر روزہ رکھنے کے بعد تو خاص طور پر ان بُرائیوں سے بچنا ضروری ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس شخص نے روزہ رکھ کر جھوٹی بات کہی اور جھوٹ پر عمل کو نہیں چھوڑا، تو اللہ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ شخص کھانا اور پینا چھوڑ دے۔“

روزہ ایک ایسی نعمت ہے، جس کی بدولت انسان بُرائیوں سے دور ہو کر نیکیوں کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اپنا وقت فضول کاموں اور فضول باتوں میں ضائع نہیں کرتا، نماز کی پابندی کرتا ہے اور قرآن پاک کی تلاوت میں اپنا زیادہ وقت گزارتا ہے، اس لیے روزہ رکھنے والے بچوں کو اس کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے، تاکہ بہت سارا ثواب حاصل ہو سکے۔ روزہ رکھنے اور کھولنے کی دعا ضرور یاد کرلیں۔

روزے دار بچوں کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ روزے کے فرائض کے بارے میں ضروری معلومات بھی حاصل کریں۔ یہ معلومات بچے اپنے والدین سے، اپنے استادوں سے اور اپنے گھر کے بزرگوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابیں بھی ان کی خوب رہنمائی کر سکتی ہیں۔ روزہ کیا ہے اور اسے رکھنے کے بعد ہمیں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟ اگر یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد روزہ رکھیں گے تو روزے کا ثواب بھی خوب ملے گا اور روزہ رکھنے کا مزہ بھی آئے گا۔

ایک بات اور بھی ضروری ہے کہ رمضان غم خواری اور ہمدردی کا مہینا ہے، اس لیے ہمیں بھی عملی طور پر ہمدردی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اپنے غریب رشتے داروں، پڑوسیوں اور دوستوں کی ضروریات کا خیال رکھیں اور عملی طور پر اسے پورا کرنے کی کوشش بھی کریں۔ غریب روزے داروں کو روزہ افطار کرادیں، روزے رکھنے کے لیے سحری کرائیں۔ یا ان کی کسی اور طرح سے مدد کردیں۔ اپنے روزے دار دوستوں کو روزے کی اہمیت اور ثواب کے بارے میں بتائیں۔ روزے میں قرآن پاک کی تلاوت کا بہت اجر و ثواب ہے۔ آپ بھی روزے رکھیں اور قرآن کی تلاوت کریں۔ ☆

😊ایک بار کسی وجہ سے مرزا غالب کو انگریز حکومت نے گرفتار کرلیا۔ جب مرزا غالب قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے خاں صاحب کے مکان میں آکر رہنے لگے۔

ایک روز میاں صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی۔ مرزا نے کہا: ''کون قید سے چھوٹا ہے! پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں۔''

مرسلہ : مہرین ناصر، ملتان

😊پولیس افسر (دوست سے): ''آج میں نے ایک آدمی کو رنگے ہاتھوں پکڑا۔''

دوست: ''وہ کیسے؟''

پولیس افسر: ''دیوار پر رنگ کر رہا تھا، میں نے پکڑ لیا۔''

مرسلہ : امامہ عاکفین، بہاول پور

😊استاد (شاگرد سے): ''نیم حکیم کسے کہتے ہیں؟''

شاگرد: ''وہ حکیم جو نیم کے درخت پر بیٹھا ہو۔''

استاد غصے سے: ''تو پھر اسے خطرہ جان کیوں کہتے ہیں؟''

شاگرد: ''کیوں کہ وہ گر سکتا ہے اور اس کی جان جانے کا خطرہ ہے۔''

مرسلہ : بی بی ہاجرہ، سکندر پور

😊ایک نوکر کو اس کے مالک نے چھے مہینے سے تنخواہ نہیں دی تھی۔ نوکر اپنی بیماری کا بہانہ کر کے چار پائی پر لیٹ گیا۔

مالک نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو بلایا۔ نوکر نے ڈاکٹر کو بتایا: ''ڈاکٹر صاحب! میں بیمار نہیں ہوں۔ چھے مہینے سے میری تنخواہ نہیں ملی، اس لیے جھوٹ موٹ بیمار ہو گیا ہوں۔''

ڈاکٹر: ''ذرا اِدھر ہو جاؤ!''

''کیوں؟'' نوکر نے پوچھا۔

''میں بھی یہیں لیٹ جاتا ہوں، مجھے بھی تمھارے مالک نے چھے مہینے سے فیس

نہیں دی ہے۔"

مرسلہ : محمد احمد، ملتان

☺ ایک محفل میں کسی نے سوال کیا: "پُر سکون اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے ایک آدمی کے پاس کس چیز کا ہونا ضروری ہے؟"

"بہرا پن۔" ایک پچاس سالہ آدمی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

مرسلہ : سیدہ اریبہ بتول، کراچی

☺ بارش میں بھیگتا ہوا ایک طالب علم ہاسٹل میں واپس آیا تو اس کا دوست اس کی برساتی پہن کر باہر نکل رہا تھا۔ اس نے غصے سے کہا: "تم نے میری اجازت کے بغیر میری برساتی کیوں پہنی؟"

دوسرا دوست معصومیت سے: "کیا تم پسند کرو گے کہ تمھارا سب سے خوب صورت سوٹ جو میں نے پہن رکھا ہے، بارش میں بھیگ کر خراب ہو جائے؟"

مرسلہ : کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☺ ایک نیا بیٹسمین بیٹنگ کے لیے جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ وہ پویلین کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ ایک تماشائی نے اس کے قریب جا کر کہا: "سنیں، میں نے آپ پر شرط لگائی ہے۔"

"اوہ! بیٹسمین کا چہرہ تمتمایا: "مگر ایسا لگتا ہے کہ میں آج صفر پر ہی آؤٹ ہو جاؤں گا۔"

"خدا کرے، ایسا ہی ہو۔ میں نے بھی شرط لگائی ہے۔" تماشائی نے کہا۔

مرسلہ : واجد خان، شکارپور

☺ لڑکے نے مرغی کو دیکھ کر اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ کتنی پیاری چڑیا ہے۔

بڑے بھائی نے کہا: "یہ چڑیا نہیں، بطخ ہے۔"

مرسلہ : شیرونیہ شاہ، حیدرآباد

☺ فوٹو گرافر: "میڈم! آپ تصویر چھوٹی بنوانا چاہتی ہیں یا بڑی؟"

خاتون: "چھوٹی۔"

فوٹو گرافر: "تو پھر اپنا منہ بند کر لیں۔"

مرسلہ : سید علی حیدر علی شاہ، اوباڑو

☺ گاہک (دکان دار سے): "بڑی گارنٹی

دیتے ہو، چپل تو دو دن بھی نہیں چلی۔''

دکان دار: ''ہوا کیا ہے؟''

گاہک: '' ایک تقریب میں گیا تھا، وہاں سے غائب ہوگئی۔''

مرسلہ : نورالھدیٰ اشفاق، ٹنڈو جان محمد

😊 جوش ملیح آبادی ایک بار گرمی کے موسم میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہاں ملاقاتیوں کا ایک جمِ غفیر پہلے سے موجود تھا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی ملاقات کے لیے باری نہ آئی تو انھوں نے اُکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر چپراسی کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں بھجوایا۔

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

مولانا نے یہ شعر پڑھا تو زیرِلب مسکرائے اور فوراً جوش صاحب کو اندر طلب کرلیا۔

مرسلہ : مہک اکرم، لیاقت آباد

😊 گاہک بیرے سے: ''میں نے تم سے آلو کا پراٹھا مانگا تھا، مگر اس میں تو آلو تھے ہی نہیں۔''

بیرا: ''اگر آپ کشمیری چائے مانگتے تو کیا آپ کو اس میں کشمیر ملتا؟''

مرسلہ : پلوشہ مریم، پشاور

😊 ایک شخص نے دکان دار سے کہا: ''کیا آپ پرانی چیزیں خریدتے ہیں؟''

''جی ہاں، میرا یہی کاربار ہے۔'' دکان دار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس نپولین کے زمانے کا نایاب ٹائپ رائٹر ہے۔'' اس نے شخص نے کہا۔

دکان دار نے حیرت سے پوچھا: ''مگر نپولین کے زمانے میں تو ٹائپ رائٹر ایجاد ہی نہیں ہوا تھا؟''

''اسی لیے تو نایاب ہے۔'' اس شخص نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

مرسلہ : طارق محمود کھوسو، کشمور

😊 استاد: ''چیئر مین کسے کہتے ہیں؟''

شاگرد: ''جناب! کرسیاں بنانے والے کو۔''

مرسلہ : کلثوم عدنان، کراچی

😊 لڑکا (ڈاکٹر سے): ''کیا آپ کے پاس درد کی دوا ہے؟''

ڈاکٹر نے پوچھا: ''درد کہاں ہے؟''

لڑکا: ''ابھی تو نہیں ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہوگا، جب ابو امتحان کی رپورٹ دیکھیں گے۔''

مرسلہ : طہورا عدنان، کراچی

😊 ایک صاحب جہاز میں سوار ہونے جا رہے تھے۔ جب انھوں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ائیر ہوسٹس نے انھیں رُکنے کے لیے کہا: ''ویٹ پلیز۔''

وہ صاحب یک دم بولے: ''پچانوے پونڈ۔''

مرسلہ : عدنان رفیع، کراچی

😊 ۱۹۴۴ء میں ایک بار جوش ملیح آباد الہٰ آباد یونی ورسٹی گئے۔ ادبی تقریب میں ڈائس پر جوش کے علاوہ فراق گورکھ پوری بھی موجود تھے۔ جوش نے اپنی طویل نظم کا تعارف کرتے ہوئے کہا کہ اس میں تخلیقِ کائنات کی ابتدا میں شیطان کی زبانی کچھ شعر ہیں۔ یعنی کیا کہتا ہے۔

فراق نے سامعین سے کہا: ''سنیے حضرات! شیطان کیا بولتا ہے۔'' اور اس کے بعد جوش کو بولنے کا اشارہ کیا۔

مرسلہ : امیر زیب، پشاور

😊 ایک شوگر کے مریض نے فریج کھول کر مٹھائی کا ڈبا نکالا اور مٹھائی چاٹنے لگا۔ بیوی نے یہ حرکت دیکھ کر فوراً کہا: ''آپ کو ڈاکٹر صاحب نے مٹھائی کھانے سے منع کیا ہے۔''

مریض نے جواب دیا: ''ڈاکٹر صاحب نے مٹھائی کھانے سے منع کیا ہے، میں تو صرف چاٹ رہا ہوں۔''

مرسلہ : دلیل الرحمٰن خاں، کراچی

😊 وکیل (ملزم سے): ''تم نے پولیس افسر کی جیب میں جلتی ہوئی سگرٹ کیوں ڈالی تھی؟''

ملزم: ''انھوں نے خود کہا تھا کہ اگر کام کروانا ہے تو پہلے میری جیب گرم کرو۔''

مرسلہ : اسفندیار، نواب شاہ

😊 ایک دوست: ''آپ کا چھوٹا بچہ بہت بُری بُری گالیاں دیتا ہے۔''

دوسرا دوست: ''کوئی بات نہیں، جب بڑا ہوگا تو اچھی اچھی گالیاں دیا کرے گا۔''

مرسلہ : افراح صدیقی، کراچی

☺ ایک جہاز پرواز کے لیے کھڑا تھا۔ پہلی دفعہ سوار ہونے والے ایک مسافر نے ہوا باز سے پوچھا: "کیوں بھئی، تم نے جہاز میں پیٹرول تو بھروالیا ہے نا؟"

ہوا باز نے کہا: "ہاں، مگر تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

مسافر نے جواب دیا: "کہیں ایسا نہ ہو کہ راستے میں پیٹرول ختم ہو جائے اور تم کہو کہ چلو، اُترو، جہاز کو دھکا لگاؤ۔"

مرسلہ : ایمان عائشہ، نواب شاہ

☺ ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا: "میری نظر میں پیسے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

دوسرا دوست: "اچھا تو کسی سے پیسے اُدھار مانگ کر دیکھو، پتا چل جائے گا۔"

مرسلہ : تحریم خان، نارتھ کراچی

☺ مشہور شاعر اختر شیرانی لاہور کی ایک دکان کالج بوٹ شاپ انارکلی میں جوتے خریدنے پہنچے۔ دکان دار نے ان کے سامنے جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اختر شیرانی نے ایک ایک جوڑا دیکھا، مگر کوئی جوڑا پسند نہیں آیا۔ قیمتوں پر بھی انھیں اعتراض تھا، دکان دار طنزیہ لہجے میں بولا: "اتنے جوتے پڑے ہیں، آپ اب بھی مطمئن نہیں ہوئے؟"

اختر شیرانی ایک جوڑا پہنتے ہوئے بولے: "بارہ روپے لیتے ہو، یا اُتاروں جوتا؟"

مرسلہ : محمد منیر نواز، ناظم آباد

☺ ایک کنجوس مریض نرس پر ناراض ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے نرس کو بُلا کر پوچھا: "یہ کس بات پر ناراض ہے؟"

نرس نے بتایا: "اس بات پر کہ وہ دوا ختم ہونے سے پہلے کیوں ٹھیک ہو گیا۔"

مرسلہ : طارق قاسم، نواب شاہ

☺ انسپکٹر چور سے: "تم نے بڑی دلیری سے گھر کی دیوار پھلانگی، بڑی آسانی سے زیور چُرایا اور بغیر آہٹ پیدا کیے رفو چکر ہو گئے۔"

چور شرماتے ہوئے: "جناب! اتنی تعریف کر کے شرمندہ تو نہ کریں۔"

مرسلہ : عبیرہ صابر کراچی

😊 ایک پاگل نے دوسرے پاگل کی جان بچائی۔ ڈاکٹر نے اسے دفتر بلایا اور کہا: ''تم نے اس پاگل کو پانی کے تالاب سے نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ تم تو بہت سمجھ دار ہو، لیکن افسوس کہ بعد میں اس نے رسی سے لٹک کر خودکشی کر لی۔''

پاگل: ''ہنس کر بولا: ''وہ تو میں نے اسے سوکھنے کے لیے لٹکایا تھا۔''

مرسلہ : محمد جہانگیر عباس جوئیہ، کراچی

😊 پہلا پاگل دوسرے سے: ''میں بچپن میں مینارِ پاکستان سے گر گیا تھا۔''

دوسرا پاگل: ''پھر تم بچ گئے یا مر گئے؟''

پہلا پاگل: ''مجھے پتا نہیں، میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔''

مرسلہ : مجاہد الرحمن، کراچی

😊 مالک سو رہا تھا کہ اچانک گولی چلنے کی آواز سن کر جاگ گیا۔ سامنے دیکھا تو اس کا ملازم بندوق لیے کھڑا تھا۔ مالک نے پوچھا: ''کیا ہوا ہے؟''

ملازم نے جواب دیا: ''جناب! یہاں ایک چڑیا بیٹھی تھی، میں نے سوچا کہ اس کی چوں چوں سے آپ کی نیند خراب ہوگی، اس لیے میں نے اسے گولی مار دی۔''

مرسلہ : سیدہ اسماء رضوان گیلانی،

😊 نعیم: ''آج میں نے عزم کیا ہے کہ اب آیندہ کبھی شرط نہیں لگاؤں گا۔''

وسیم: ''لیکن تم ایسا کبھی نہیں کرو گے۔''

نعیم: ''ضرور کروں گا، شرط لگا لو۔''

مرسلہ : سیدہ نور عابدی، کراچی

😊 ایک ہاتھی تالاب میں نہا رہا تھا۔ ایک چوہا اس کے پاس آیا اور رُعب سے بولا: ''باہر آؤ، باہر آؤ۔''

جب ہاتھی تالاب سے باہر آ گیا تو چوہا بولا: ''اب جاؤ، جا کر نہا لو۔''

ہاتھی کو بڑا غصہ آیا۔ وہ بولا: ''مجھے تالاب سے باہر کیوں نکالا؟''

چوہا بولا: ''میری نیکر گم ہو گئی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ تم نے تو نہیں پہن لی ہے۔''

مرسلہ : محمد معین الدین افتخار، لاہور

نونہال خبرنامہ

سلیم فرخی

امریکا میں مسلسل ۱۱۳ برس سے روشن بلب

اکثر ہمیں اپنے گھر کے بلب خراب ہونے پر تبدیل کرنا پڑ جاتے ہیں، مگر دنیا میں ایک ایسا بلب بھی ہے جو مسلسل ۱۱۳ برس سے روشن ہے۔ امریکی ریاست کیلیفورنیا کے علاقے ''لیور مور'' میں قائم فائر اسٹیشن نمبر ۶ میں ۱۹۰۱ء میں یہ بلب روشن کیا گیا تھا، یہ آج تک خراب نہیں ہوا۔ اس بلب کے تیار کیے جانے کی درست تاریخ کا تو علم نہیں ہو سکا، مگر ہر سال ۱۸ جون کو اس کی سال گرہ منائی جاتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ فائر اسٹیشن میں نصب اس بلب کی روشنی کچھ مدھم ہو چکی ہے، مگر یہ اب بھی مسلسل چوبیس گھنٹے روشن رہتا ہے۔

فائر اسٹیشن کے ملازمین کے مطابق یہ بلب ۱۱۳ برس کے دوران صرف دو مرتبہ بند کیا گیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۶ء میں جب اسے ایک دوسرے فائر اسٹیشن میں نصب کیا گیا تھا۔ دوسری مرتبہ ۲۰۱۳ء میں اسے چار گھنٹوں کے لیے بند رکھا گیا۔ ۴۰ برس قبل اس بلب کو جب دوسرے فائر اسٹیشن میں منتقل کیا گیا تو اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے پولیس اور فائر ٹرک کی حفاظت میں روانہ کیا گیا اور صرف ۲۲ منٹ کے بعد ہی اسے نئی جگہ پر دوبارہ سے روشن کر دیا گیا تھا۔ ☆

گھوڑی کا تحفہ

علی اسد

بہت دنوں کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک غریب کسان رہا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام دانیال تھا۔ اس سے چھوٹے بیٹے کا نام جلال اور سب سے چھوٹے بیٹے کا نام کامران تھا۔ دانیال اور جلال تو بڑے ہوشیار اور محنتی تھے، مگر کامران بہت کاہل تھا۔ وہ دن دن بھر آرام سے ٹانگیں پھیلائے خیالات میں کھویا رہتا۔ اسی وجہ سے لوگ اُسے بے وقوف سمجھا کرتے تھے۔

ایک دن کسان جب صبح کو اپنے کھیت پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے گھاس کے گٹھوں میں کچھ کمی نظر آ رہی ہے۔ اس نے فوراً اپنے بڑے بیٹے کو بلایا اور کہا: ”دانیال!

کوئی شخص ہماری گھاس چُرا رہا ہے۔ آج رات تم کھیت پر چوکیداری کرو اور چور کو پکڑ لو۔''

یہ سن کر دانیال بولا: ''نا بابا! یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد رات کو مجھ سے نہ جاگا جائے گا۔''

کسان یہ جواب سن کر اپنے دوسرے بیٹے جلال سے مخاطب ہوا اور اس سے کہا کہ وہ رات کو چوکیداری کرلے۔ جلال بولا: ''یہ کام تو کامران ہی کر سکتا ہے۔ دن بھر آخر وہ پڑا ہی تو رہتا ہے۔ اسے رات کو جاگنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔''

چناں چہ یہی طے ہو گیا اور کامران چوکیداری کرنے رات کو بیٹھ گیا۔ خالی بیٹھے بیٹھے اُسے اور تو کوئی کام تھا نہیں، لہٰذا وہ آسمان پر تاروں کو گننے لگا۔ وقت گزرتا گیا۔ آخر عین آدھی رات کو اُسے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ اب جو وہ دیکھتا ہے تو سامنے ایک نہایت خوب صورت سفید گھوڑی چوکڑیاں بھرتی چلی آ رہی ہے۔ کامران درخت کی آڑ میں چھپ کر گھوڑی کو دیکھتا رہا اور جوں ہی گھوڑی گھاس کھانے میں مشغول ہوئی، وہ لپک کر اس پر سوار ہونے لگا۔ گھوڑی نے کامران کو جو دیکھا تو وہ بھاگنے لگی، مگر کامران نے بڑے زور سے ایک جست لگائی اور گھوڑی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور پھر مضبوطی سے اس کے اَیال پکڑ لیے۔ گھوڑی نے بڑی اُچھل کود کی اور چاہا کہ کامران کو گرا دے، مگر کامران بھی اپنی دُھن کا پکا تھا۔ وہ گھوڑی سے چمٹا ہی رہا۔ آخر گھوڑی تھک گئی اور کامران سے کہنے لگی: ''تم تین روز تک مجھے کسی محفوظ مقام پر رہنے دو اور میری خوراک کا انتظام کر دو، پھر اس کے بعد اگر تم مجھے آزاد کر دو تو میں تمھیں ایک نادر تحفہ دوں گی۔''

کامران یہ سن کر بڑا خوش ہوا، کیوں کہ آج تک کسی نے اسے کوئی تحفہ نہیں دیا تھا۔

چناں چہ کامران نے گھوڑی کو ایک سنسان جگہ پر آرام سے پہنچا دیا اور روز اُسے دانہ پانی دینے لگا۔ تیسرے روز صبح جب کامران وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھوڑی نے تین بچے دے رکھے ہیں۔ یہ تینوں بچے بڑے خوب صورت تھے۔ دو تو ذرا بڑے تھے، لیکن تیسرا بچہ اتنا ننھا منا تھا کہ بالکل کھلونا معلوم ہو رہا تھا۔ کامران اس چھوٹے بچے کو دیکھ کر زیادہ خوش ہوا۔ گھوڑی نے کامران سے کہا: ''بڑے بچوں کو تم بادشاہ کے ہاتھ فروخت کر دینا، مگر اس ننھے منے گھوڑے کو نہ تو کسی کو دینا اور نہ فروخت کرنا۔ یہ ساری عمر تمھاری خدمت کرتا رہے گا اور تمھارا بہترین دوست ثابت ہوگا۔''

کامران ننھے منے گھوڑے کو گود میں لیے بیٹھا گھوڑی کی باتیں سن رہا تھا۔ اب جو اس نے نظریں اُٹھا کر گھوڑی کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو دیکھا کہ گھوڑی غائب ہو چکی ہے۔

کامران حیران بیٹھا رہ گیا۔

اس کے بعد سے کامران ان تینوں گھوڑوں کو دانہ پانی دیتا رہا۔ اسی طرح کئی ہفتے گزر گئے اور اس عرصے میں گھوڑے بڑی تیزی سے بڑے ہو گئے، مگر ننھا منا گھوڑا زیادہ بڑا نہ ہوا۔ اتفاق سے ایک رات جب کامران سو گیا تو دانیال اس جگہ پہنچ گیا، جہاں یہ گھوڑے تھے۔ دانیال نے جو یہ گھوڑے دیکھے تو اس کے دل میں لالچ آ گیا۔ وہ فوراً جلال کو بلا لایا اور گھوڑوں کو دکھا کر بولا: ''کل شہر میں میلا لگنے والا ہے۔ بادشاہ کے اصطبل کے لیے بھی لوگ گھوڑے خریدنے آئیں گے، چلو، ان گھوڑوں کو کل وہیں بیچ ڈالیں۔''

چناں چہ دوسرے دن صبح یہ دونوں چپکے سے گئے اور دونوں بڑے گھوڑوں کو لے کر روانہ ہو گئے۔ صرف وہ ننھا منا گھوڑا باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد جب کامران وہاں پہنچا تو گھوڑوں کو موجود نہ پا کر بڑا پریشان ہوا۔ اتنے میں وہ ننھا منا گھوڑا کامران کے پاس آ گیا اور بولا: ''تمھارے بھائی ان گھوڑوں کو لے گئے ہیں، تاکہ انھیں فروخت کر ڈالیں۔''

ننھے گھوڑے کو باتیں کرتے دیکھ کر کامران بڑا حیران ہوا، کہنے لگا: ''اچھا تو تمھیں باتیں کرنا بھی آتا ہے؟''

اس پر ننھا گھوڑا بولا: ''اب تک مجھے بات کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی، بہر حال اب وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ تم جلدی سے میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ، جلدی کرو۔''

کامران فوراً اس گھوڑے پر سوار ہو گیا اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزرنے پائی تھی کہ سامنے اسے اپنے دونوں بھائی دکھائی دے گئے۔ کامران

نے لپک کر انھیں پکڑ لیا۔ کامران کو دیکھ کر دونوں بھائی باتیں بنانے لگے، بولے: ''ہم لوگ تو ان گھوڑوں پر سوار ہو کر صرف میلا دیکھنے جا رہے تھے۔''

کامران نے کہا: ''بہت خوب، چلو میں بھی چلتا ہوں۔''

شہر میں بڑے ٹھاٹھ سے میلا لگا ہوا تھا۔ بادشاہ کے اصطبل کے حاکمِ خاص بھی موجود تھے۔ انھوں نے جو کامران کے دونوں گھوڑوں کو دیکھا تو اُن کی خوب صورتی پر اَش اَش کرنے لگے اور فوراً بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ بھی ان گھوڑوں کو دیکھ کر کہنے لگا: ''بے شک، یہ گھوڑے تو واقعی نہایت حسین ہیں۔ میں انھیں خاص اپنی سواری کے لیے خریدوں گا۔''

چناں چہ سودا ہو گیا اور کامران کو بادشاہ نے دو تھیلیاں اشرفیوں کی دے کر گھوڑے

خرید لیے، مگر جب بادشاہ کے آدمی گھوڑوں کو لے کر چلنے لگے تو گھوڑے اڑ گئے۔ کسی طرح چلنے کو راضی ہی نہ ہوئے۔ اس پر حاکمِ اصطبل بولا: ''یہ گھوڑے اس لڑکے کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جائیں گے۔''

یہ سن کر بادشاہ نے کامران سے کہا: ''چوں کہ یہ گھوڑے تمھارے بغیر نہیں رہ سکتے، لہٰذا تم بھی میرے ساتھ چلو۔ آج سے تم بھی میرے اصطبل کے ایک حاکم مقرر کیے جاتے ہو۔''

چناں چہ کامران نے اشرفیوں کی تھیلیاں تو اپنے بھائیوں کے ہاتھ اپنے باپ کو روانہ کر دیں اور خود بادشاہ کے ہمراہ گھوڑے لے کر چل دیا۔ بادشاہ کے محل میں اُس کے دن بڑے آرام سے گزرنے لگے۔ اس کا ننھا منا گھوڑا ہر وقت اُس کے ساتھ رہا کرتا تھا، لیکن اصطبل کا حاکمِ خاص کامران سے جلنے لگا۔ چناں چہ اُس نے کامران کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ ایک دن اُس نے بادشاہ سے کہا: ''جہاں پناہ! یہ لڑکا تو بڑی شیخیاں بگھارتا ہے۔ کل کہتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو سنہری ہرنی بھی پکڑ کر لے آؤں۔''

یہ سن کر بادشاہ بڑے اشتیاق سے پوچھنے لگا: ''ارے کیا واقعی سنہری ہرنی جو اُس دور دراز جنوبی علاقے میں رہتی ہے؟ جاؤ، کامران کو ابھی حاضر کرو۔''

جب کامران حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس سے سنہری ہرنی لانے کی فرمائش کی۔ کامران حیران ہو کر بولا: ''مگر جہاں پناہ! میں تو جانتا بھی نہیں کہ یہ سنہری ہرنی ہے کہاں۔ بھلا اسے کیسے لا سکتا ہوں۔''

اس جواب سے بادشاہ سخت ناراض ہوا، بولا: ''اچھا تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم حکم عدولی کرنا چاہتے ہو۔ جاؤ، تین دن کے اندر ہرن کو ہمارے حضور پیش کرو، ورنہ تمھاری جان کی خیر نہیں۔''

بے چارہ کامران یہ سن کر نہایت پریشان ہوا اور اصطبل واپس لوٹا۔ ننھے منے گھوڑے نے کامران کو پریشان جو دیکھا تو پوچھنے لگا: ''میرے دوست! کیا بات ہے، تم پریشان کیوں ہو؟''

کامران نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اس پر گھوڑا بولا: ''گھبراؤ نہیں۔ بادشاہ سے کہو کہ وہ تمھیں ایک سونے کی بالٹی اور سونے کے دانے دے دیں اور ایک ریشمی رسّی بھی دے دیں۔ ہم لوگ کل صبح روانہ ہو جائیں گے۔''

بادشاہ نے یہ سب چیزیں مہیا کر دیں اور سورج نکلنے سے پہلے ہی کامران اپنے ننھے منے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ سورج ابھی اچھی طرح سے آسمان پر نمودار بھی نہ ہوا تھا کہ کامران آدھی دنیا کا سفر طے کر چکا تھا۔ گھوڑے نے کہا: ''دیکھو، یہی ہے وہ جنوبی علاقہ، جہاں وہ سنہری ہرنی رہتی ہے۔''

پھر گھوڑے نے کامران سے کہا کہ سنہرے دانوں کو درختوں کے نیچے ڈال دے اور خود ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو جائے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ سنہری ہرنی نمودار ہوئی اور دانہ کھانے آ گئی۔ کامران نے ریشمی رسی کا پھندا بنا کر بڑے زور سے ہرنی کے سر پر پھینکا۔ پھندا ٹھیک ہرنی کی گردن میں بیٹھ گیا۔ کامران نے تیزی سے رسی گھسیٹنا شروع کر دی۔ پھندا ہرنی کی گردن میں کس گیا۔ چناں چہ ہرنی کو پکڑ کر کامران اپنے

گھوڑے پر سوار ہو گیا اور واپس لوٹ آیا۔

بادشاہ نے جب سنہری ہرنی کو دیکھا تو وہ بے حد خوش ہوا، مگر اصطبل کا حاکمِ خاص اور جل گیا۔ چناں چہ اُس نے ایک دن بادشاہ سے کہا: ''حضور! یہ کامران تو بڑی بڑی ڈینگیں مارتا رہتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اس خوب صورت شاہ زادی کو بھی اُٹھا لاؤں، جو اس دور دراز شمالی علاقے میں رہتی ہے۔''

یہ سن کر بادشاہ بڑے اشتیاق سے بولا: ''ارے کیا وہی خوب صورت شاہ زادی جو سمندر کے کنارے کشتی میں گھومتی رہتی ہے؟ جاؤ، کامران کو ابھی بلواؤ۔''

جب کامران آ گیا تو بادشاہ نے اُسے حکم دیا کہ شاہ زادی کو لے آئے۔

کامران نے عاجزی سے کہا: ''جہاں پناہ! میں تو جانتا بھی نہیں کہ یہ شاہ زادی ہے کہاں!''

یہ سن کر بادشاہ کو پھر طیش آ گیا، بولا: ''اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمھیں یہ زحمت گوارا نہیں۔ جاؤ، چھے دن کے عرصے میں شاہ زادی کو ہمارے حضور حاضر کر دو، ورنہ تمھاری جان کی خیر نہیں۔''

بے چارہ کامران پھر پریشان حال اصطبل واپس لوٹا۔ ننھے گھوڑے نے جو کامران کی حالت دیکھی تو بولا: ''کیا بات ہے؟''

کامران نے تمام باتیں بتا دیں، یہ سب سن کر گھوڑا بولا: ''اپنے آنسو پونچھ ڈالو۔ فوراً ایک ریشمی خیمہ حاصل کرو اور سونے چاندی کے برتن اور بہترین سے بہترین غذائیں بھی ساتھ لے لو۔ ہم لوگ صبح تڑکے روانہ ہو جائیں گے۔''

کامران نے فوراً ان سب چیزیں کا بندوبست کیا اور دوسرے دن صبح اپنے گھوڑے پر روانہ ہو گیا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میلوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے ہو رہا تھا۔ آخر وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے، جہاں پر دنیا ختم تھی۔ گھوڑا یہاں رک گیا۔ کامران گھوڑے سے اُتر پڑا۔ گھوڑے نے کہا: ''اب یہاں پر تم اپنی خیمہ نصب کردو اور وہ سونے چاندی کے برتن اس میں سجا کر رکھ دو، پھر ان برتنوں میں وہ تمام لذیذ غذائیں رکھ دو۔''

کامران نے جب یہ سب کام کر لیے تو گھوڑا بولا: ''اب تم چھپ جاؤ اور دیکھتے رہو۔ جب شاہ زادی آجائے اور خیمے میں داخل ہو کر کھانے میں مصروف ہو تو جا کر اُسے پکڑ لینا اور مجھے آواز دے دینا۔''

چناں چہ کامران انتظار کرنے لگا اور خیمے کی آڑ سے سمندر کی جانب دیکھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک کشتی نظر آئی۔ کشتی کنارے آکر رک گئی اور شاہ زادی کشتی سے اُتر کر دوڑتی ہوئی خیمے کی جانب لپکی۔ شاہ زادی کو دیکھ کر کامران اُس کے حُسن سے مرعوب ہو گیا۔ شاہ زادی خیمے میں جا کر کھانے میں مصروف تھی کہ عین اسی وقت کامران نے اُسے جا کر پکڑ لیا اور گھوڑے کو پکارنے لگا۔

شاہ زادی چیخنے لگی: ''مجھے چھوڑ دو! مجھے چھوڑ دو۔''

اتنے میں شاہ زادی نے گردن گھما کر جب کامران کی شکل دیکھی تو وہ قدرے مطمئن ہوئی، پوچھنے لگی: ''تم کون ہو؟''

کامران نے کہا: ''میں تو محض ایک بے وقوف ہوں، جسے لوگ کامران کہتے ہیں۔ میں تم کو بادشاہ کے پاس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

آخر کامران شاہ زادی کو لے کر شاہی محل پہنچ گیا۔ بادشاہ، شاہ زادی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ایک دن اس سے شادی کے لیے کہا، لیکن شاہ زادی تیار نہ ہوئی۔ ایک دن اس نے کامران سے کہا: ”کامران! میں اس سے شادی ہرگز نہ کروں گی۔“

کامران نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”گھبراؤ نہیں شاہ زادی! میں ابھی اپنے ننھے منے گھوڑے سے پوچھتا ہوں۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی ترکیب نکال لے گا۔“

چناں چہ شاہ زادی اور کامران گھوڑے کے پاس پہنچے اور تمام باتیں بتادیں۔ گھوڑا نہایت سنجیدگی سے تمام باتیں سنتا رہا، پھر بولا: ”اس مرتبہ تم نے بڑا مشکل مسئلہ میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ بہر حال میں تمھیں جو صلاح دیتا ہوں، اُسے خوب غور سے سنو اور اسی پر عمل کرو۔“ اس کے بعد گھوڑے نے چپکے سے ان دونوں سے کچھ کہہ دیا۔

دوسرے دن شاہ زادی بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئی اور بولی: ”آپ نے کہا تھا کہ آپ کا دل جوان ہے، اس لیے اگر آپ بھی اتنے ہی جوان ہو جائیں جتنا کہ آپ کا دل ہے تو پھر میں آپ سے شادی کرلوں گی۔“

یہ سن کر بادشاہ بڑا چکرایا، کہنے لگا: ”بھلا انسان دوبارہ جوان کیسے ہوسکتا ہے؟“

شاہ زادی نے کہا: ”حضور! ایک طریقہ ہے۔ اگر انسان بکری کے دودھ میں ایک منٹ کے لیے ڈبکی لگالے تو پھر وہ اتنا ہی جوان ہوسکتا ہے، جتنا کہ اس کا دل۔“

بادشاہ بڑی حیرت سے بولا: ”واقعی کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟“

شاہ زادی نے کہا: ”جی ہاں، ہمارے ملک میں تو یہ عام دستور ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجیے گا کہ آپ کا دل واقعی اتنا ہی جوان ہے، جتنا کہ آپ کہتے ہیں۔“

بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ ایک بڑی سی دیگ میں بکری کا دودھ بھر کر پیش کیا جائے۔ فوراً خدام دوڑ گئے اور ذرا ہی دیر میں ایک بڑی سی دیگ بکری کے دودھ سے بھری ہوئی لا کر رکھ دی گئی۔ تمام حاضرینِ دربار حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

بادشاہ نے دیگ میں ایک ڈُبکی لگائی۔ بادشاہ کا سارا جسم دودھ کے اندر ڈوب گیا۔ سب لوگ ایک منٹ کے وقفے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ ایک منٹ ایک گھنٹا معلوم ہونے لگا۔ آخر وقت پورا ہوا اور بادشاہ باہر نکلنے لگا۔ لوگ بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ دیگ سے باہر نکل کر بادشاہ بڑے فخر سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا اور مسکرائے جا رہا تھا۔ درباریوں نے جو دیکھا تو آپس میں کانا پھوسی ہونے لگی اور لوگ کہنے لگے:

''ارے، یہ تو ذرا بھی نہیں بدلے!''

شاہ زادی نے آگے بڑھ کر بادشاہ سے کہا: ''جہاں پناہ! مجھے افسوس ہے، مگر اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ آپ کا دل اتنا جوان نہیں جتنا کہ آپ خیال کرتے ہیں۔''

بادشاہ نے بڑے تعجب سے پوچھا: ''ہائیں، کیا میں اب جوان اور خوب صورت نہیں ہو گیا؟''

شاہ زادی نے فوراً لپک کر بادشاہ کے سامنے ایک آئینہ پیش کر دیا۔ آئینے میں بادشاہ کو جب اپنی وہی بوڑھی شکل نظر آئی تو وہ بڑے غم زدہ لہجے میں بولا: ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔''

شاہ زادی نے فوراً کہا: ''لیکن آپ خدانخواستہ ابھی اتنے ضعیف بھی نہیں کہ ہم دونوں کی شادی نہ کروا سکیں۔''

اس پر بادشاہ نے کہا: ''ہاں، ہاں یہ میں ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر بادشاہ نے فوراً شاہ زادی کی شادی کامران سے کروادی اور دونوں کو بہت سے تحفے تحائف بھی دیے۔ پھر کامران اور شاہ زادی اسی ننھے منے گھوڑے پر سوار ہوکر شاہ زادی کے وطن کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں کامران نے کہا: ''آج ہمیں یہ ساری خوشی اسی گھوڑے کی عقل مندی کی بدولت نصیب ہوئی۔ بکری کے دودھ میں ڈبکی لگانے والی ترکیب واقعی اس نے خوب بتائی۔''

شاہ زادی اور کامران جب شاہ زادی کے وطن پہنچ گئے تو یہ دونوں آرام سے وہاں حکومت کرنے لگے۔ ان کا وفادار گھوڑا ابھی دربار میں کامران اور شاہ زادی کے درمیان ہر وقت بیٹھا رہتا تھا۔

☆

برجستہ جواب

شہنشاہ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکار کے دوران ایک گاؤں کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ ایک خدمت گار گاؤں میں انڈے خریدنے گیا۔ دیہاتی دکان دار کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ انڈے بادشاہ کے لیے خریدے جارہے ہیں تو پانچ اشرفی فی انڈا قیمت طلب کی۔ خدمت گار نے دکان دار کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ یہ جانتے ہوئے کہ یہ انڈے بادشاہ کے لیے درکار ہیں، یہ شخص اس قدر زیادہ قیمت مانگ رہا ہے۔

بادشاہ نے نہایت نرمی سے پوچھا: ''کیا اس گاؤں میں انڈے کم ملتے ہیں؟''

دیہاتی نے کہا: ''حضور! انڈے ملتے ہیں، لیکن شہنشاہ بہت کم ملتے ہیں۔''

بادشاہ اس کے برجستہ جواب سے بہت خوش ہوا اور انڈوں کی منھ مانگی قیمت کے علاوہ اس کو معقول انعام دے کر رخصت کیا۔

مرسلہ : کومل فاطمہ اللہ بخش، لیاری، کراچی

دریائے وائی کی جل پری

ڈاکٹر عمران مشتاق، آسٹریلیا

''جل پری'' یا مرمیڈ (MERMAID) ایک ایسی سمندری مخلوق ہے، جس کا آدھا دھڑ عورت کا اور آدھا مچھلی کا ہوتا ہے، آپ نے اس کے بارے میں تو کئی کہانیاں سنی ہوں گی۔ جل پری کا ذکر ہزاروں سالوں سے کیا جا رہا ہے۔ ملک شام کی پرانی کہانیوں میں اُن کا ذکر تین ہزار سال پہلے سے ملتا ہے۔ ایشیا، یورپ، شمالی امریکا اور افریقا کے لوگوں نے جل پری کو دیکھنے کا دعوا کیا ہے۔ امریکا کی دریافت کرنے والے کرسٹوفر کولمبس نے تین جل پریوں کو دیکھنے کا ذکر اپنی یادداشت میں کیا ہے۔ ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن کے نزدیک سمندر کے کنارے ''لٹل مرمیڈ'' کا مجسمہ موجود ہے۔

آج ہم آپ کو دریائے وائی کی جل پری کی کہانی سناتے ہیں۔ شمالی ویلز کی پہاڑیوں سے ایک دریا نکلتا ہے، جسے دریائے وائی کہا جاتا ہے، جو انگلستان کی کاؤنٹیز ہرٹ فورڈ شائر اور مون موتھ شائر سے ہوتے ہوئے براستہ برسٹل چینل سمندر میں جا گرتا ہے۔

دریائے وائی کے گرد پھیلی ہوئی خوب صورت وادی میں ایک گاؤں آباد تھا۔ جنگلی گلاب کے پھولوں اور قدیم اونچے اونچے درختوں سے گھرا ہوا وہ گاؤں اپنے اندر ایک خاص دل کشی رکھتا تھا۔ درخت اتنے قدیم تھے کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ درخت کس نے اور کب لگوائے تھے۔ لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ اُن کے دادا اور پڑدادا کے زمانے میں بھی وہ درخت موجود تھے۔

دریائے وائی کے کنارے ایک پُرانا گرجا گھر تھا، جس کے ٹاور سے ایک بڑی

سی بیل یعنی گھنٹا لٹکا ہوا تھا۔ گرجا گھر کا پادری جب وہ بیل بجاتا تو اُس کی آواز دور دور تک گونجتی اور گاؤں کے سب ہی لوگ گرجا گھر کے سامنے پہنچ جاتے۔

ایک رات وادی میں زبردست طوفان آیا۔ بجلی زور سے کڑکی اور تیز بارش سے دریائے وائی میں سیلاب آ گیا۔ اگلے دن جب طوفان کا زور تھما تو پادری نے گرجا گھر کا رُخ کیا۔ گاؤں والوں کا مالی نقصان تو ہوا تھا، مگر جانی نقصان سے وہ محفوظ رہے تھے۔ پادری شکرانے کے طور پہ گرجا گھر کی بیل کو بجانا چاہتا تھا۔ وہ جب گرجا گھر پہنچا تو اُس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ رات کے طوفان نے گرجا گھر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، مگر گرجا گھر کی بیل غائب تھی۔ پادری کے ساتھ ساتھ گاؤں کے لوگوں نے بھی بیل تلاش کی، مگر وہ نہیں ملی۔

گاؤں کے بچوں نے ایک دن گاؤں سے کافی دور گرجا گھر کی بیل کو ڈھونڈ لیا۔ بیل دریا کے بیچوں بیچ ایک خشک سے ٹاپو کے پاس ایسے پڑی ہوئی تھی کہ آدھی دریا میں ڈوبی ہوئی تھی اور آدھی ٹاپو کی زمین پہ رکھی ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ ہر اتوار کی شام کو بیل سے اُبھرنے والی آواز موسیقی بن کر دریا کی سطح پر سفر کرتے ہوئے دور دور تک پہنچ جاتی۔ بچوں نے بیل کے اندر ایک جل پری کو دیکھا۔ جل پری نے بیل کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جل پری کا اوپری دھڑ ایک خوب صورت لڑکی کا تھا اور نچلا دھڑ ایک سنہری مچھلی کا تھا۔ اُس کے چمک دار سنہری بال اُس کے خوب صورت چہرے پہ خوب بھلے لگتے تھے۔ فاصلہ اتنا تھا کہ بچے یہ نہ جان سکے کہ جل پری کی آنکھیں کالی تھیں یا سبز یا نیلی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھوری ہوں یا پھر اور کوئی رنگ بھی ممکن ہے۔ ہر بچے نے جل پری کی

آنکھوں کا رنگ مختلف ہی بتایا تھا۔

گاؤں کے لوگوں نے جب جل پری کو دیکھا تو پہلے تو وہ دہشت زدہ ہو گئے اور پھر انھیں غصہ آنے لگا۔

ایک بولا: ''یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

دوسرے نے کہا: ''سمندر کی ایک عجیب و غریب مخلوق نے ہماری بیل پہ قبضہ کر لیا ہے۔''

گاؤں کے پادری کا خیال تھا کہ سمندری مخلوق نے نہ صرف اُن کے گرجا گھر کے گھنٹے کو چُرا لیا ہے، بلکہ اُسے اپنا گھر بھی بنا لیا ہے، جو کہ غلط بات ہے۔

گاؤں کے لوگ پادری سمیت گاؤں کی بوڑھی جادوگرنی کے پاس گئے۔ اُس نے ان لوگوں کو بتایا کہ انھیں کیا کرنا ہوگا اور سختی سے تاکید کی کہ اس عمل کے دوران سب لوگ خاموش رہیں گے اور کوئی بھی نہیں بولے گا، جب تک کہ بیل واپس گرجا گھر تک نہیں پہنچ جاتی۔

رات کی تاریکی میں چاند کی چاندنی انھیں راستہ دکھا رہی تھی۔ گاؤں والوں نے ایک بڑے چھکڑے کے ذریعے سے یہ مشن انجام دیا۔ چھکڑے کو چھے طاقت ور بیل کھینچ رہے تھے۔ وہ موٹے موٹے رسوں سے گرجا گھر کے گھنٹے کو باندھ کر چھکڑے کی مدد سے کھینچ کر گرجا گھر کے دروازے تک لے آئے۔ جل پری میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی اور اُسے پتا ہی نہ چلا کہ گاؤں والوں نے اُسے بیل سمیت قید کر لیا ہے۔ گاؤں والوں نے سارا عمل انتہائی خاموشی سے کیا تھا اور کسی نے جل پری کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

گاؤں والے بچوں کو بھول گئے تھے۔ ابھی صبح ہونے میں دیر تھی کہ ایک بچہ

سوتے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے جل پری کو خواب میں دیکھا تھا۔ اُس نے اپنے بھائی کو جگایا اور دونوں گرجا گھر کی طرف چل پڑے۔ گرجا گھر تک پہنچتے پہنچتے اُن کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اُس رات کئی بچوں نے جل پری کو خواب میں دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ تکلیف میں تھی۔

ایک بچے نے جل پری کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا: ''خوب صورت جل پری گھنٹی کے اندر سوئی ہوئی ہے۔''

دوسرے بچوں نے بھی خوشی کے عالم میں اُس کا ساتھ دیا: ''جل پری کتنی خوب صورت ہے۔ اُسے آرام سے سونے دو۔ وہ کہیں جاگ نہ جائے۔''

بچوں کے نعرہ لگانے سے جل پری جاگ گئی۔ جل پری کے جاگنے سے بوڑھی جادوگرنی کا جادو ٹوٹ گیا۔ جل پری نے ایک زوردار پھونک ماری تو لمحوں کے اندر جل پری گھنٹی سمیت وہاں سے غائب ہو گئی۔ گاؤں والے حیرت سے کھڑے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کہتے ہیں کہ بیل دوبارہ دریا کے بیچوں بیچ ٹاپو کے پاس پہنچ گئی تھی۔ گھنٹی آدھی دریا میں ڈوبی ہوئی تھی اور آدھی ٹاپو کی زمین پہ رکھی ہوئی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہر اتوار کی شام کو گھنٹے سے اُبھرنے والی آواز موسیقی بن کر دریا کی سطح پر سفر کرتے ہوئے دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی ''دریائے والی کی جل پری'' کا خوشی سے بھرپور قہقہہ بھی سُنائی دیتا ہے۔ بیل اب بھی سب کو نظر آتی ہے، مگر جل پری کو صرف بچے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اُن کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہے اور بچوں کے لیے وہ نظارہ نہایت دل کش ہوتا ہے۔

☆
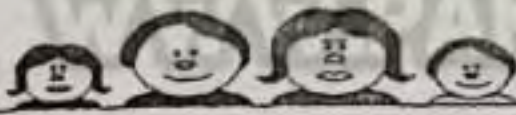
نونہال ادیب

لکھنے والے نونہال

ارسلان اللہ خاں، حیدر آباد	عائشہ الیاس، کراچی
نادیہ اقبال، کراچی	شایان انس، جہلم
ارم علی، کراچی	طارق محمود کھوسو، کشمور
کومل فاطمہ اللہ بخش، لیاری، کراچی	ناعمہ ذوالفقار علی، کراچی
ش۔م۔دانش، میانوالی	عبدالصمد تاجی، کراچی
محمد افضل انصاری، چوہنگ سٹی	سمیہ وسیم، سکھر

نعتِ رسولِ مقبولؐ

شاعر : ارسلان اللہ خاں، حیدر آباد

کیا کہوں میں مصطفیؐ کی شان میں
اُنؐ کی عظمت دیکھ لو قرآن میں

قیصر و کسریٰ کے ہل جائیں محل
ایسی سطوت ہے مرے سلطان میں

رات دن پڑھتے رہو انؐ پر درود
یہ عمل کام آئے گا میزان میں

کوئی بھی اس کو نہیں جھٹلا سکا
ہے صداقت آپؐ کے فرمان میں

ہم کریں دعوا نبیؐ کے عشق کا
اتنی گنجایش کہاں دامان میں

لطف آ جائے اگر کوثر کے جام
وہ پلائیں حشر کے میدان میں

کر سکے مدحت کا انؐ کی حق ادا
ہے سکت اتنی کہاں انسان میں

ارسلاںؔ لاکھوں غلامانِ نبیؐ
شکر ہے بستے ہیں پاکستان میں

ادا شناس

نادیہ اقبال، کراچی

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک دفعہ مشہور ہوگیا کہ آپ دکن پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اگر چہ آپ اس

معاملے کا ارادہ کر چکے تھے، مگر ابھی تک کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ معتمدِ خاص سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا، مگر لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو چکی تھی۔

سلطان عالمگیر حیران تھے کہ لوگوں میں یہ خبر کیسے پھیل گئی۔ محکمۂ خاص کو حکم دیا گیا کہ سراغ لگائیں کہ اس بات کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ کھوج لگتے لگتے پتا چلا کہ سب سے پہلے ملازمِ خاص کی زبان سے یہ بات سنی گئی۔ اس کو بُلا کر پوچھا گیا: ''بتاؤ! تم نے یہ بات کس سے سنی؟''

اس نے عرض کیا: ''جہاں پناہ! میری عمر اس خانوادہ کے قدموں میں گزری ہے۔ غلام ادا شناس ہے۔ ایک صبح حضور کو وضو کروا رہا تھا کہ آپ نے ایک لمحہ توقف فرمایا۔ دکن کی جانب نگاہ فرمائی اور دستِ مبارک مونچھوں پہ پھیرا۔ میں سمجھ گیا کہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔''

ماہِ مبارک

مرسلہ : ارم علی، کراچی

آ گیا وہ مہینا جو سرتاج ہے
باقی گیارہ مہینوں کی معراج ہے
ملی جس میں اُمت کو حق کی کتاب
اور ایک ایک نیکی پہ ڈھیروں ثواب
یہ مہینا ہے صبر اور برداشت کا
فضیلتوں، رحمتوں اور برکات کا
ہر مسلماں پہ ہے فرض، روزے رکھے
جھوٹ اور چغلی سے ہر پل بچے
ماہِ رمضاں میں ''رب'' جس نے راضی کیا
گویا جنت میں اس نے ٹھکانا کیا

پاکستان میں ٹیلے وِژن کا آغاز

کومل فاطمہ اللہ بخش، لیاری، کراچی

دنیا ۱۹۲۶ء میں ٹی وی سے آگاہ ہوئی۔ پاکستان میں ۱۹۶۴ء میں ٹیلے وِژن کا آغاز ہوا۔ اس طرح دنیا میں اور پاکستان میں ٹی وی کی آمد کے درمیان ۳۸ برس کا فاصلہ موجود ہے۔

۱۹۶۱ء میں حکومتِ پاکستان کی دعوت پر تین جاپانی ماہرین پاکستان آئے اور انھوں نے ٹی وی کے قیام کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں کراچی میں منعقدہ ایک بین الاقوامی صنعتی نمائش میں فلپس الیکٹرک کمپنی نے تجرباتی ٹی وی اسٹیشن قائم کیا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں صدرِ مملکت محمد ایوب خان نے ٹی وی کے قیام کی حتمی منظوری دے دی اور ابتدا میں ڈھاکا، کراچی اور لاہور میں ٹی وی اسٹیشنوں کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ جاپان کی الیکٹرک کمپنی این ای سی (NEC) نے اپنے اخراجات پر پاکستان میں تجرباتی بنیاد پر ٹی وی اسٹیشن قائم کرنے کی پیش کش کی اور اس طرح ۲۶ نومبر ۱۹۶۴ء میں پاکستان ٹیلے وژن کی باقاعدہ نشریات کا افتتاح کیا گیا۔

زندگی کا سودا

ش۔م۔دانش، میانوالی

''یہ درختوں کا گھنا جنگل آپ کی زمین کے کئی سو ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ اگر آپ اسے کٹوا دیں تو آپ کی فصل دگنی ہو سکتی ہے۔ ان درختوں کے بیچنے سے جو رقم ملے گی، اس سے آپ مزید زمین خرید سکتے ہیں، اس طرح ان کو بیچنے سے آپ کو دو فائدے ہوں گے، زمین بھی زیادہ ہو جائے گی اور فصل بھی بڑھ جائے گی۔'' اسلم نے زمیندار اشرف علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی اسلم! تم نے تو بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ مجھے تو کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا۔ میں ان درختوں کو کٹوا کر بشیرے کی زمین بھی لے لوں گا اور کھیتی باڑی کو اور وسیع کر دوں گا۔'' اشرف علی نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

اسلم کے جانے کے بعد اشرف علی سارا دن درختوں کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ وہ ایک بڑا زمیندار تھا۔ اس کے پاس کئی مربع زمین تھی، لیکن اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس اس سے کئی گنا زیادہ زمین ہوتی، تا کہ وہ

اپنے گاؤں کا چودھری بن سکتا۔ اب اسلم کی بات سن کر اس پُرانی خواہش نے ایک بار پھر انگڑائی لی تھی۔ اشرف علی نے اپنے بیٹوں کو بھی اس بارے میں بتایا۔ بڑے بیٹے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن چھوٹا بیٹا اس کے خلاف تھا۔ اس نے کہا: "درخت زمین کی جان ہوتے ہیں ابا! یہ ہمیں سایہ دیتے ہیں اور زمین کو کٹاؤ سے بچاتے ہیں۔ یہ ہمیں تازہ ہوا بھی مہیا کرتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو ہم ایک لمحہ بھی زندہ نہ رہ سکیں۔"

اشرف علی نے یہ سب ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا، کیوں کہ اس کے سر پر تو صرف ایک ہی دُھن سوار تھی کہ وہ درخت بیچ کر نئی زمین خریدے گا اور پیداوار کو دگنا کرے گا۔ آخر اس کا چھوٹا بیٹا ارشد تنگ آ گیا اور اس نے اسے سمجھانا چھوڑ دیا۔ اشرف علی درخت بیچنے کے انتظام میں لگ گیا۔ دو ہفتے بعد اس کا سودا ایک ٹھیکیدار سے ہو گیا۔ اس نے اشرف علی کو ضمانت کے طور پر دس لاکھ رپے بھی دے دیے اور باقی پیسے درخت کاٹتے وقت دینا طے پایا تھا۔ اس کے درخت پچھتر لاکھ رپے میں بکنے تھے۔ کل ٹھیکیدار درخت کاٹنے آنے والا تھا۔ اشرف علی بہت خوش تھا کہ وہ نئی زمین بھی خرید لے گا اور پُرانی کاشت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو گاؤں کا چودھری سمجھنے لگا تھا اور ہواؤں میں اُڑتا پھر رہا تھا۔

......☆......☆......

چاند پر جانے کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ اشرف علی اور اس کے دونوں بیٹے سعید اور ارشد چاند پر جانے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے مخصوص لباس بھی پہن لیا تھا اور اب وہ چاند گاڑی کے تیار ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اشرف علی گاؤں کا چودھری بن چکا تھا اور چودھری بننے کے بعد اس نے سوچا کہ ایک چکر چاند کا بھی لگا لینا چاہیے۔

چاند گاڑی میں ان کے علاوہ دو اور آدمی تھے۔ ایک پائلٹ اور دوسرا اس کا معاون تھا۔

تھوڑی دیر بعد چاند گاڑی ایک جھٹکے سے اوپر اُٹھی اور چاند کی طرف پرواز کر گئی۔

"ہم دس منٹ بعد چاند پر اُترنے والے ہیں۔" پائلٹ نے اعلان کیا۔ پھر دس منٹ بعد چاند گاڑی چاند کی سطح پر اُتر گئی۔

"اب آپ اپنے لباسوں کے ساتھ لگے آکسیجن ماسک پہن لیں، کیوں کہ چاند پر آکسیجن موجود نہیں ہے، البتہ چاند گاڑی میں آکسیجن کا انتظام ہے۔" پائلٹ کے کہنے پر انھوں نے ماسک چڑھا لیے۔ جہاں چاند گاڑی اُتری تھی، وہاں ایک گڑھا سا بن گیا تھا۔

"چاند کہاں ہوگا؟" اچانک ماسک کے اندر لگے مائیک پر چودھری اشرف علی کی آواز سنائی دی۔

"کیوں کیا ہوا ابا جان؟" ارشد نے چونک کر پوچھا۔

"میں یہاں سے زمین کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" چودھری اشرف علی نے جواب دیا۔

"اوپر دیکھیں ابا جان! زمین ہمارے سر کے اوپر ہے۔" چودھری اشرف علی نے سر اوپر اُٹھایا اور حیرت سے زمین کو تکنے لگا۔

پھر وہ چل پڑے اور چلتے ہی گئے۔ وہ ارد گرد بھی نظریں دوڑا رہے تھے۔ چلنے میں ایک عجیب سا لطف محسوس ہو رہا تھا۔ انھیں یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ چلنے کی بجائے ہوا میں تیر رہے ہوں۔ جب وہ ایک قدم اُٹھاتے تو دوسرا قدم تھوڑی دیر بعد ہی تین، چار فیٹ کے فاصلے پر زمین پر ٹکتا تھا۔ یونہی چلتے چلتے وہ بہت دور نکل آئے۔

"آپ بہت زیادہ دور مت جایئے گا چودھری صاحب! ورنہ سلینڈروں میں آکسیجن ختم بھی ہو سکتی ہے اور ایسے وقت میں ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔" اچانک پائلٹ کی آواز سنائی دی اور حیرت سے ایک

دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ اب انھیں احساس ہوا کہ وہ بہت دور نکل آئے ہیں۔

"بس تھوڑا سا آگے جا کر ہم واپس آجائیں گے۔" چودھری اشرف علی نے پائلٹ سے کہا اور پھر وہ آگے چل پڑے۔

"ابا جان! ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ کہیں سچ مچ سلینڈروں میں آکسیجن کم نہ ہو جائے۔" ارشد نے پندرہ، بیس منٹ چلنے کے بعد کہا۔

"ابھی تو ہم نے صحیح طرح سے چاند کی سیر بھی نہیں کی۔" چودھری صاحب نے جواب دیا اور پھر وہ چلنے لگے۔ چودھری صاحب ہر منظر کو بچوں کی طرح دل چسپی سے دیکھ رہے تھے اور بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔ کافی دیر بعد انھیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان کا دم گھٹنے لگا ہو۔

"مم......مم......میرا دم گھٹ رہا ہے۔" چودھری اشرف علی ہکلا کر بولے۔

"ابا جان! میں نے کہا بھی تھا کہ آکسیجن ختم ہو جائے گی، لیکن آپ مانتے ہی نہیں تھے۔" ارشد نے جواب دیا اور پھر اس نے پائلٹ کو پکارنا شروع کر دیا، لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

"لگتا ہے ہم چاند گاڑی کی رینج سے بہت دور نکل آئے ہیں۔" سعید نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہمیں واپس چلنا چاہیے۔" چودھری اشرف علی بولے۔

"اب ہم اتنی دور نہیں جا سکتے ابا جان! ہماری آکسیجن ختم ہونے والی ہے، کاش! یہاں ایک دو درخت ہوتے۔" ارشد نے جواب دیا۔

"درخت! لیکن کیوں؟" چودھری صاحب حیران ہو کر بولے۔

"جی ہاں درخت، کیوں کہ اگر درخت ہوتے تو ہمیں ان سلینڈروں کی آکسیجن کی

ضرورت ہی نہ پڑتی، درخت ہمیں آکسیجن مہیا کردیتے۔'' ارشد نے افسوس میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

'' کاش ! میں اپنے درخت نہ بیچتا۔'' چودھری اشرف علی نے مایوسی سے کہا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا، جیسے اس کے درخت بیچنے کی وجہ سے ہی اب اسے آکسیجن نہیں مل رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ درخت نہ بیچتا تو اب یہاں درخت ہی درخت ہوتے اور اسے تازہ ہوا مل رہی ہوتی۔ پھر اسے تصور ہی تصور میں اپنے وہ درخت نظر آنے لگے، جنھیں وہ بیچ کر کٹوا چکا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی سانس گھٹ رہی ہو۔ اس کا چودھری بن جانا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا تھا، جب کہ اس کے درخت اسے زندگی مہیا کرسکتے تھے۔ آخری خیال اس کے ذہن میں یہی آیا اور پھر اس کا ذہن ڈوبتا چلا گیا۔

اشرف علی اچانک ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی بھیانک موت کے منھ سے نکل کر آیا ہو۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔

'' اوہ خدایا! شکر ہے کہ یہ ایک خواب تھا۔'' اشرف علی نے لرزتے ہوئے کہا، کیوں کہ اسے یاد آ گیا تھا کہ ابھی اس کے درخت نہیں کٹے اور نہ وہ چودھری بنا ہے۔ وہ جلدی جلدی اُٹھا اور اپنے کھیتوں کی طرف چل دیا، تا کہ ٹھیکیدار کو درخت کاٹنے اور تازہ ہوا ختم کرنے سے روک سکے۔

اس کے قدموں میں تیزی تھی، وہ بھلا زندگی کا سودا کیسے کرسکتا تھا؟

گرمی کا موسم

محمد افضل انصاری، چوہنگ سٹی

گرمی کا موسم ہے آیا
پسینے نے سب کو ہے نہلایا
چرندے، پرندے ہیں گھبرائے پھرتے
اور انسان ڈھونڈتا پھرتا ہے سایہ

چاروں طرف گرم لُو ہے لُو ہے
ٹھنڈی ہوا کا بھی جھونکا نہ آیا
دیکھو تو ہر چیز ایسے گرم ہے
لکڑی کا جیسے ہو کوئلہ دہکایا

پرندوں کا پاکستان

عائشہ الیاس، کراچی

وہ ایک خوب صورت باغ تھا۔ جس میں تاحدِ نگاہ ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ایک جانب مختلف پھلوں کے درخت لگے تھے تو دوسری طرف مہکتے ہوئے پھول دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ زید اس باغ کے درمیان کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا؟ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا وہ کسی جنت میں آ گیا ہو۔ مختلف پرندوں کی سُریلی آوازیں اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔

کافی دیر وہ وہاں کھڑا نظارے کرتا رہا۔ اچانک اسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو بہت دور اسے ایک تالاب نظر آیا۔ وہ تالاب کی طرف بڑھ گیا۔ تالاب کے نزدیک پہنچ کر وہ حیران رہ گیا۔ تالاب کا پانی اتنا صاف اور شفاف تھا کہ اس کی صاف ستھری تہ تک نظر آ رہی تھی۔ اس نے تالاب کا پانی پیا تو وہ اتنا شیریں تھا کہ اس نے آج تک ایسا شیریں پانی نہ پیا تھا۔

پانی پینے کے بعد وہ جیسے ہی مڑا تو اس کے سامنے کہیں سے ایک انتہائی خوب صورت پرندہ آ کر بیٹھ گیا اور اپنی بولی میں کچھ بولنے لگا۔ زید کو محسوس ہوا کہ وہ اس پرندے کی بولی سمجھ سکتا ہے۔ اس نے سنا کہ وہ پرندہ کہہ رہا ہے: ”تم کون ہو؟ تمھارا تعلق کہاں سے ہے؟ تم یہاں کیسے آئے؟“

زید نے جواب دیا: ”میرا نام زید ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں یہاں کیسے آیا۔“

پرندے نے خوش گوار حیرت کے ساتھ کہا: ”اچھا تم پاکستان سے آئے ہو! تمھیں

معلوم ہے کہ یہ جگہ جہاں تم کھڑے ہو، یہ پرندوں کا پاکستان ہے۔ جب ہمارا یعنی پرندوں کا پاکستان خوب صورت ہے تو انسانوں کا پاکستان تو اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہوگا۔"

زید کہنے لگا: "تم غلط سمجھ رہے ہو، پیارے پرندے! پاکستان میں خوب صورتی تو بہت ہے، مگر اس خوب صورتی کو برباد کرنے والے اس سے بھی زیادہ ہیں۔ وہاں امن کے لیے لوگ ترستے ہیں۔"

زید بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ اس کے کانوں میں دادا جان کی آواز آرہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے: "زید بیٹے! مسلمانوں نے جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا، وہ پرندوں کے پاکستان جیسا ہی تھا۔ ان کا آدھا خواب تو پورا ہوگیا، یعنی پاکستان تو بن گیا۔ باقی آدھا خواب یعنی اس کو پرندوں کے پاکستان جیسا بنانے کی ذمے داری نئی نسل کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ نئی نسل اپنے ذمے داری کو پہچانے گی اور صدقِ دل سے انھیں پورا کرے گی۔

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ڈھول کا پول

شایان انس، جہلم

بڑا کبھی تُو بول نہ بول
کھل جائے گا ڈھول کا پول
شیخی مت بگھار اے پیارے
دامن اپنا جھاڑ اے پیارے
پیار کی راہ سدھار اے پیارے
پیار محبت کا رس گھول
کھل جائے گا ڈھول کا پول
یاد رہے میرا یہ کہنا
حق و صداقت تیرا گہنا
جھوٹی کوئی بات نہ کرنا
بات کو پہلے اپنی تول
کھل جائے گا ڈھول کا پول

ولیم شیکسپیئر

طارق محمود کھوسو، کشمور

ولیم شیکسپیئر کو دنیائے ادب کا ایک بہت بڑا شاعر اور ادیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۵۶۴ء میں برطانیہ کے ایک چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا۔ اس کے والد "جون شیکسپیئر" دستانوں اور اون کا کاروبار اور اسٹیج ڈراموں کے لیے لائسنس جاری کرتے تھے۔ اس وقت شیکسپیئر بھی اپنے باپ کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس طرح اسے ڈراموں سے دل چسپی پیدا ہوئی۔

ولیم شیکسپیئر نے جتنے بھی ڈرامے اور نظمیں لکھیں، وہ آج تک مشہور ہیں۔ کچھ نظمیں اور ڈرامے تعلیمی نصاب کا حصہ بھی بنا دیے گئے ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں ہر قسم کا پہلو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں مزاح بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔ خوشی بھی ہے اور غم بھی۔

ولیم شیکسپیئر کی وفات ۱۶۱۶ء میں ۵۲ سال کی عمر میں ہوئی۔ کئی سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی شیکسپیئر اور اس کی لکھی ہوئی تحریریں لوگوں کی دلوں میں زندہ ہیں۔ واقعی قلم اور محنت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

جو ڈر گیا وہ مر گیا

ناعمہ ذوالفقار علی، کراچی

ایک کسان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام "جو" تھا، جب کہ دوسرے کا نام "وہ" تھا۔ دونوں بھائی نکمے تھے۔ ان کا باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ مجھے تو ایک نہ ایک دن مرنا ہے، کیوں نہ میں اپنے کام پر بیٹوں کو لگا دوں۔

ایک دن باپ نے دونوں کو پاس بلایا اور کہا: "میرے پیارے بچو! میں اب کم زور ہو گیا ہوں۔ اب مجھ میں کام کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ مجھے تو ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے۔ اب میں اپنا کام تمھیں دینا چاہتا ہوں۔ لڑنا نہیں کام مل جل کر کرنا۔"

دونوں نے ہامی بھر لی۔

کسان کے مرنے کے بعد دونوں بھائی

اپنی زمین میں جاتے اور کام کرتے پھر شام کو گھر لوٹ آتے۔ روٹی کھا کر خدا کا شکر ادا کرتے اور رات کو سو جاتے۔ پھر صبح ہوتے ہی کام میں لگ جاتے۔

ایک دن ''جو'' اور ''وہ'' اپنی زمین میں کام کر رہے تھے کہ انھوں نے اپنی طرف ایک ریچھ آتا دیکھا۔ ''جو'' اسے دیکھتے ہی ڈر گیا۔ جب کہ ''وہ'' اُدھر ہی گر کر مر گیا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جو ڈر گیا، وہ مر گیا۔

پیاری بچی

عبدالصمد تاجی، کراچی

مریم پیاری بچی ہے
بھولی بھالی لگتی ہے
اس کا نیلا بستہ ہے
جس کا پیلا دستہ ہے
باجی اسے پڑھاتی ہیں
ہوم ورک کراتی ہیں
پڑھنا لکھنا کام ہے اس کا
اچھے بچوں میں نام ہے اس کا

لالچ کا انجام

سمیہ وسیم، سکھر

ایک گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑا بھائی امیر تھا اور چھوٹا بھائی غریب، لیکن ہر ایک کی مدد کرنے والا تھا۔ ایک دفعہ جب چھوٹا بھائی اپنے گھر والوں کے لیے بازار سے کھانا لینے جا رہا تھا تو راستے میں اسے ایک فقیر ملا۔ اس نے کہا: ''خدا کے لیے اگر تمھارے پاس کھانے کو کچھ ہے تو مجھے دے دو۔ دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔''

چھوٹے بھائی نے فوراً وہ پیسے اس فقیر کو دے دیے۔ وہ فقیر بہت خوش ہوا اور اس نے کہا: ''تم نے میری مدد کی اور میں تمھیں اس کا انعام ضرور دوں گا۔ سیدھے مشرق کی طرف چلے جاؤ، وہاں تم کو ایک غار نظر آئے گا۔ اس میں تین بونے رہتے ہیں۔ ان سے کہنا کہ بابا نے مجھے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ وہ چکی مجھے دے دو، جو بابا نے تمھارے پاس رکھوائی تھی اور ان

بونوں کے لیے تم کوئی تحفہ بھی لے کر جانا۔" یہ کہہ کر وہ بزرگ چلے گئے۔

چھوٹا بھائی مشرق کی طرف چل پڑا۔ اس نے ان بونوں کے لیے کیلے لیے، تا کہ وہ ان کو تحفہ دے سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کو ایک غار نظر آیا۔ وہ اس غار میں چلا گیا۔ تینوں بونے اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ان بونوں کو بابا والی بات بتائی اور ان کو تحفے میں کیلے دیے۔ یہ دیکھ کر بونے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: "اے نوجوان! تم نے ہمارا دل خوش کر دیا۔ یہ لو دو ہزار اشرفیاں اور یہ لو چکی، اس کو تم رات کے وقت لال کپڑا ڈال کر کہنا، چکی چکی آٹا نکال۔ اور اس کے علاوہ جو چیز تم کو چاہیے، وہ مانگ لینا۔ یہ چکی تم کو دے دے گی۔"

یہ سن کر چھوٹا بھائی بہت خوش ہوا اور چکی اور اشرفیاں لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ اب چھوٹا بھائی جو چیز چکی سے مانگتا، وہ اس کو مل جاتی۔ اب وہ راتوں رات امیر ہو گیا۔ اس نے ایک بنگلہ بنایا، گاڑی خریدی اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارنے لگا۔ جب اس کے بڑے بھائی نے دیکھا تو یہ راتوں رات امیر ہو گیا، لیکن اس کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آیا۔ آخر اس نے پتا لگا لیا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ یہ چکی اس سے ہتھیا لی جائے۔ ایک دن جب چھوٹا بھائی سو رہا تھا تو بڑا بھائی اس کے گھر سے چکی کو چُرا لایا اور اپنی بیوی اور بچی کو کشتی میں بٹھا کر دوسرے شہر روانہ ہو گیا۔ جب وہ لوگ کشتی میں جا رہے تھے تو بڑے بھائی نے سوچا، دیکھتا ہوں کہ یہ چکی کیا کیا کرتی ہے۔ اس نے اس پر کپڑا ڈال کر کہا: "چکی چکی، نمک نکال۔" چکی نے نمک نکالنا شروع کیا۔ بڑا بھائی بہت خوش ہوا، پر تھوڑی دیر میں کشتی میں اتنا سارا نمک ہو گیا کہ چکی سمیت سب سمندر میں ڈوب گئے۔ کہتے ہیں کہ وہ چکی اب بھی چل رہی ہے اور اس میں سے نمک نکل رہا ہے، تبھی تو سمندر کا پانی کھارا ہے۔ ☆

آدھی ملاقات

یہ خطوط ہمدرد نونہال شمارہ اپریل ۲۰۱۵ء کے بارے میں ہیں

٭ ہمدرد نونہال واقعی نونہالوں کا ہمدرد ہے۔ سرورق سے لے کر نونہال لغت تک ہر چیز بامعنی ہے۔ شہید حکیم محمد سعید کی ''جاگو جگاؤ'' ان کی یاد کو تازہ کر دیتی ہے۔ مسعود احمد برکاتی کی ''پہلی بات'' ہمیشہ کچھ نہ کچھ سکھاتی ہے۔ ''روشن خیالات'' اچھی زندگی گزارنے کے لیے بہترین نصیحتوں کا خزانہ ہوتے ہیں۔ ''علم دریچے'' پڑھ کر دماغ کو تقویت ملتی ہے۔ ''ہنسی گھر'' پڑھ کر ہم اپنے سارے غم بھول جاتے ہیں۔ ''نونہال مصور'' کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی ہر نونہال اپنے طریقے سے پوری کوشش کر رہا ہے۔ ''معلومات افزا'' کے سوالات سے علم مزید بڑھ جاتا ہے۔ ہر کہانی اپنی جگہ مزے دار ہوتی ہے۔ ''نونہال ادیب'' پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ اس میں پہیلیوں کا اضافہ کر دیا جائے تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔ ''ہنڈ کلیا'' سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ''نونہال لغت'' ایک ایسی چیز ہے جس میں ہمیں ہر الفاظ کے معنی مل جاتے ہیں۔ **لبنیٰ جبیں، کراچی۔**

٭ اپریل کا شمارہ نہایت زبردست تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ پہلی بات پڑھ کر بھی بہت مزہ آیا۔ علم دریچے اور نونہال ادیب بھی پسند آئے۔ الغرض پورا ہی شمارہ پسند آیا۔ **سیف الرحمٰن، حیدرآباد۔**

٭ اپریل کے سرورق پر آمنہ صدیقی اور زینب صدیقی بہت اچھی لگ رہیں تھیں اور اس کا بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ''شیر کا خواب اور لڑکی اور پہاڑ کا جن'' لاجواب تحریریں تھیں۔ ''فرض شناس'' اور ''بڑھیا کا انصاف'' سبق آموز کہانیاں تھیں۔ ہنسی گھر کچھ خاص نہیں تھا۔ ''بلاعنوان کہانی'' متاثر کن نہیں تھی۔ ''پھول نگر'' بہت اچھی کہانی تھی۔ **سید اعظم مسعود، کراچی۔**

٭ اپریل کے سرورق کی تصویر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دونوں جڑواں بچیوں کو دیکھ کر بہت اچھا لگا اور حیرت بھی ہوئی۔ کہانیوں میں زبردست کہانیاں لڑکی پہاڑ اور جن (فضیلہ ذکاء بھٹی)، بڑھیا کا انصاف (عبدالرؤف تاجور) اور بلاعنوان کہانی (محمد شاہد حفیظ) تھی۔ اس کے علاوہ کہانی ننھا سہارا (جدون ادیب) بھی سبق آموز تھی۔ **کرن فدا حسین، لیموچہ کالونی۔**

٭ اپریل کا شمارہ لاجواب تھا۔ روشن خیالات، جاگو جگاؤ اور پہلی بات ہمیشہ کی طرح سبق آموز تھیں۔ ویسے تو ساری کہانیاں اچھی تھیں، مگر ننھا سہارا اور فرض شناس سپر ہٹ تھیں۔ انکل! کیا حضرت لقمان اللہ کے پیغمبر تھے؟ **سید اویس عظیم علی، کراچی۔**

حضرت لقمان بڑی مقدس ہستی تھے، لیکن اللہ کے پیغمبر نہیں تھے۔

٭ کسی خاص تحریر کا نام لے کر اس کی تعریف نہیں کروں گا۔ قصہ مختصر، نونہال ایک محل ہے جس پر خوب صورت کہانیوں کے ہیرے چمک دمک رہے ہوتے ہیں۔ مضامین کے موتی چہار سو کرنیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات اس کے صدر دروازے ہیں، جن پر سونے اور چاندی کے الفاظ سے کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ روشن خیالات وہ راہ داری ہے، جس سے گزرتے ہوئے انسان مہک اُٹھتا ہے۔ حمد باری تعالیٰ کی بارش میں بھیگ کر روح رواں جھوم اُٹھتا ہے۔ علم دریچے، علم کا خزانہ ہوتا ہے۔ **عبدالجبار سیال، ڈیرہ غازی خان۔**

٭ اپریل کا شمارہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ جاگو جگاؤ، پہلی بات سبق آموز تھی۔ ''لڑکی پہاڑ اور جن'' اور ''بڑھیا کا انصاف'' کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ بلاعنوان مزے دار تھی۔ دعا (محمد مشتاق حسین قادری)، علامہ اقبال (احمد حمدانی) اور کتاب سے پیارا (ضیاء الحسن ضیا) اچھی نظمیں لگیں۔ **محمد افضل انصاری، چوہنگ لاہور۔**

٭ اپریل کا شمارہ پڑھ کر مزہ آیا۔ تمام کہانیاں بہت لاجواب تھیں، مگر سب سے اچھی کہانیاں ''بڑھیا کا انصاف'' اور ''شیر کا خواب'' تھیں۔ اس مہینے کا خیال تو رسالے کی جان تھا۔ **نیاز احمد، کراچی۔**

٭ اپریل کا شمارہ پسند آیا۔ سرورق نے بہت حیران کیا۔ پہلے تو ہم یہ

سمجھے کہ ایک ہی بچی کے دو پوز ہیں، لیکن جب اندر نام پڑھے تو حیران رہ گئے کہ یہ دو بچیاں ہیں۔ بے ساختہ سبحان اللہ منہ سے نکلا۔ جاوید بسام کی "فرض شناس" تو پاکستانی پولیس کی عکاسی کر رہی تھی۔ بڑھیا کا انصاف (عبدالرؤف تاجور) کہانی اچھی لگی۔ ننھا سہارا (جدون ادیب) اور پھول نگر (محمد شعیب خان) بہترین تھیں۔ علامہ سے وعدہ (عبداللہ ادیب) کا مرکزی خیال بہت پرانا اور گھسا ہوا تھا۔
ریان سہیل، اسلام آباد۔

● جاگو جگاؤ میں علم کی روشنی کو بہت اچھے الفاظ میں تحریر کیا گیا ہے۔ علم حاصل کرنے سے دنیا اور آخرت میں درجات بلند ہوتے ہیں۔ آج نقل سے پاس تو ہو جاتے ہیں، مگر اصلی علم سے کورے ہوتے ہیں۔ اس مہینے کا خیال بہت ہی زبردست تھا۔ دعا بہت ہی پیاری نظم لگی۔ فرض شناس (جاوید بسام) کی کہانی سپر ہٹ کہانی لگی۔ کاش ہم سب میاں بلاقی کی طرح سچے کھرے اور ایمان دار بن جائیں تو ہمارا معاشرہ خوش حال ہو جائے۔ لڑکی پہاڑ اور جن، شیر کا خواب، علامہ سے وعدہ اور تمام کہانیاں نظمیں سب اچھی تھیں۔ **ثوبیہ رانی محمد رمضان مغل، نواب شاہ۔**

● اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سرورق بھی شان دار تھا۔ کہانیوں میں شیر کا خواب اچھی تھی۔ بلاعنوان کہانی سب سے اچھی تھی۔ **آمنہ افراسیاب، مجمہ ناز، جیا، کراچی۔**

● جاگو جگاؤ میں شہید حکیم محمد سعید صاحب کی ناقابل فراموش باتیں پڑھنے کو ملیں۔ تمام کہانیاں شان دار تھیں۔ انکل! آپ کو نونہال میں کچھ نئے انعامی سلسلے شروع کرنے چاہییں۔ **عاقب جنید، جویریہ کرن، مثنی خان، احمد جنید، دانش فراز، چکوال۔**

● اپریل کے شمارے میں بھی کسی خاص تحریر کی تعریف کرنا تو شمارے کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیوں کہ اپریل کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح معلومات سے بھرپور تھا۔ میں نے ہمدرد نونہال کا مطالعہ اول جماعت سے شروع کیا تھا اور آج ماشاء اللہ گریجویشن کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے علم کو دیگر طالب علموں میں منتقل کرنے کی ادنیٰ کوشش کر رہی ہوں۔ **سیدہ وجیہہ ناز، کراچی۔**

● اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات ہمیشہ کی طرح اچھے رہے۔ روشن خیالات نے بھی متاثر کیا۔ کہانیوں میں فرض شناس (جاوید بسام)، دو پرانی چیزیں (مسعود احمد برکاتی)، لڑکی پہاڑ اور جن (فضیلہ ذکاء بھٹی)، بڑھیا کا انصاف (عبدالرؤف تاجور)، شیر کا خواب (محمد اقبال شمس) اور بلاعنوان کہانی بہت پسند آئی۔ نظموں میں دعا، علامہ اقبال، کتاب سے پیار اور ترانہ اچھی تھیں۔ **نام پتا نامعلوم۔**

● اس دفعہ بھی شمارہ سپر ہٹ تھا۔ بلاعنوان واقعی حیرت انگیز کہانی تھی۔ **سیدہ ناعمہ ناصر، کراچی**

● بڑھیا کا انصاف (عبدالرؤف تاجور)، شیر کا خواب، بلاعنوان کہانی، لڑکی پہاڑ اور جن، ننھا سہارا، فرض شناس، پھول نگر اور علامہ سے وعدہ اچھی تحریریں تھیں۔ مضامین میں جاگو جگاؤ، پہلی بات، شیخ سعدی کی باتیں اور دو پرانی چیزیں (مسعود احمد برکاتی) اچھے تھے۔ نظموں میں محمد شفیق اعوان کی نظم "ترانہ" اچھی لگی۔ کتاب سے پیار (ضیاء الحسن ضیا)، "علامہ اقبال" اور "دعا" بھی بہت اچھی نظمیں تھیں۔ باقی تمام سلسلے اچھے لگے۔ **حافظ زبیر بن ذوالفقار، زہیر بن ذوالفقار، ناعمہ بنت ذوالفقار، کراچی۔**

● اپریل کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ سرورق کی تصویر پر آمنہ اور زینب بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ **شیروضیہ شاہ، حیدرآباد۔**

● اس بار کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔ لڑکی اور پہاڑ کا جن، بڑھیا کا انصاف اور شیر کا خواب، بہت اچھی لگیں۔ **سلمیٰ محسن علی، نوشہرہ۔**

● اپریل کا شمارہ پسند آیا۔ کہانیوں میں بلاعنوان کہانی (محمد شاہد حفیظ)، شیر کا خواب (محمد اقبال شمس)، ننھا سہارا (جدون ادیب)، فرض شناس (جاوید بسام)، بڑھیا کا انصاف (عبدالرؤف تاجور) اور پھول نگر (محمد شعیب خاں) اچھی لگیں۔ **سلمان یوسف سمیجہ، علی پور۔**

● اپریل کا شمارہ بہترین تھا۔ ساری کہانیاں بہتر، بلکہ بہترین تھیں۔ ہر سلسلہ بہت اچھا اور دل چسپ تھا۔ **زینب شاہ، فہد شاہ، لوگزی مانسہرہ۔**

● اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں فرض شناس، لڑکی، پہاڑ اور جن اور بڑھیا کا انصاف بہت اچھی تھیں۔ دیگر تحریروں میں پھول نگر اور ننھا سہارا بہت پسند آئیں۔ علم دریچے نہایت شان دار تھے۔

ہنسی گھر پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ **محمد طلحہ مغل، ڈگری۔**

* اپریل کا شمارہ بہت اچھا ہے، خاص کر کہ لڑکی پہاڑ اور جن بہت اچھی تھی۔ انکل! منی آرڈر کی فیس بہت زیادہ ہے کوئی اور طریقہ نہیں ہے کتابیں منگوانے کا؟ **مسکان محمد حسین، شہداد پور۔**

افسوس! منی آرڈر کے علاوہ کوئی اور آسان طریقہ نہیں ہے۔

* ہمدرد نونہال کا شمارہ اپریل ہر شمارے کی طرح خاص الخاص تھا۔ جاگو جگاؤ (شہید حکیم محمد سعید) علم کے حوالے سے بہت اچھا لگا اور مسعود احمد برکاتی کی ''پہلی بات'' بہت خوب صورت تھی۔ ''روشن خیالات'' سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ مضمون دو پرانی چیزیں (مسعود احمد برکاتی) پڑھا اور سوچا کہ خطاطی کرنا ضرور سیکھوں گا۔ نظموں میں اپریل کے حوالے سے علامہ اقبال (احمد ہمدانی) بہت ہی اچھی لگی اور دوسرے نمبر پر نظم کتاب سے پیار (ضیاء الحسن ضیا) بھی زبردست تھی۔ کہانیوں میں ''فرض شناس'' میں میاں بلاقی نے پھر مجرموں کو گرفتار کروادیا۔ لڑکی پہاڑ اور جن (فضیلہ ذکاء بھٹی) پڑھ کر مزہ آیا۔ بڑھیا کا انصاف (عبدالرؤف تاجور) اچھی رہی۔ پھول نگر (محمد شعیب خاں) بھی اچھی تھی۔ نونہال ادیب کی تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ مسکراتی لکیریں اچھی رہیں۔ **فیضان احمد خان، میرپور خاص۔**

* اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں لڑکی پہاڑ اور جن اور بلاعنوان کہانی سب پر بازی لے گئیں۔ باقی کہانیوں میں ننھا سہارا، شیر کا خواب، فرض شناس، علامہ سے وعدہ اور پھول نگر بھی اچھی تھیں۔ علم دریچے اور نونہال ادیب نے نونہال کی خوب صورتی میں چار چاند لگا دیے۔ اس کے علاوہ ہنسی گھر اور مسکراتی لکیریں بھی اچھی لگیں اور سرورق نے نونہال کو مزید خوب صورت بنادیا۔ **محمد اسماعیل عبدالرشید، کراچی۔**

* مجھے کہانیوں میں شیر کا خواب، لڑکی پہاڑ اور جن، پھول نگر، ننھا سہارا پسند آئیں، جب کہ فرض شناس اور بلاعنوان کہانی کچھ زیادہ ہی اچھی لگی اور ہاں علامہ سے وعدہ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ نظموں میں دعا، علامہ اقبال، کتاب سے پیار اور ترانہ چاروں نظمیں اچھی لگیں۔ علم دریچے سے معلومات حاصل ہوئی، جب کہ نونہال ادیب سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ ہنسی گھر اور مسکراتی لکیریں نے نونہال کا مزہ دوبالا کردیا۔ اس بار روشن خیالات صرف اچھے ہی نہیں، بلکہ زبردست تھے۔ جاگو جگاؤ، پہلی بات بھی ہمیشہ کی طرح کام یاب رہے۔ **محمد عمر عبدالرشید، کراچی۔**

* اپریل کے شمارے کے سرورق پر جڑواں بچیاں بہت ہی اچھی لگیں۔ جاگو جگاؤ میں شہید حکیم محمد سعید کی باتیں واقعی ہمیشہ یاد رکھنے والی ہیں۔ اس مہینے کا خیال ''خوش مزاجی سے بڑھاپا دور رہتا ہے۔'' بہت اچھا تھا اور اتفاق سے میں بہت خوش مزاج ہوں۔ پہلی بات میں آپ نے صحیح نکتے کی طرف نشان دہی کروائی۔ روشن خیالات کے تمام خیال خوب صورت اور انمول ہوتے ہیں۔ محمد مشتاق حسین قادری نے نظم ''دعا'' بہت اچھی لکھی ہے۔ کہانیاں تمام اچھی تھیں، کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ آپ کی تحریر ''دو پرانی چیزیں'' اچھی لگی۔ **مشعل نایاب بنت زاہد شاہ، کراچی۔**

* اپریل کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اس کی ہر کہانی بے مثال تھی۔ سب سے اچھی کہانی ''فرض شناس اور بلاعنوان کہانی'' تھی۔ جاگو جگاؤ، پہلی بات اور اس مہینے کے لطیفے تو بہت اچھے تھے۔ **ڈاکٹر اعراف نعیم الدین انصاری، کراچی۔**

* اپریل کا شمارہ بہت خوب ہے۔ کہانیاں سب اچھی ہیں۔ سب سے اچھی کہانی ''بڑھیا کا انصاف'' ہے۔ آپ کا مضمون ''دو پرانی چیزیں'' بھی قابل غور تحریر ہے۔ ان دو پرانی چیزوں میں سے ایک ہنر مجھے بھی آتا ہے یعنی میں کتابوں کی جلد بندی خود کر لیتا ہوں۔ ہمدرد نونہال روز بہ روز مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ **محمد حبیب الرحمٰن، کراچی۔**

* اپریل کا ہمدرد نونہال بہت اچھا لگا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ شیر کا خواب، بڑھیا کا انصاف بہت اچھی لگیں۔ **لائبہ عرفان، کراچی۔**

* اپریل کا شمارہ نہایت شان دار تھا۔ کہانیاں تو تمام ہی اچھی لگیں۔ لطائف بھی پسند آئے۔ **عبیدالرحمٰن، حیدرآباد۔**

* شمارہ اپریل نہایت شان دار تھا۔ ہر تحریر دل چسپ تھی۔ پہلی بات پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ لطائف پڑھ کر ہم لوٹ پوٹ ہو گئے۔ تمام لطیفے نئے تھے۔ نونہال ادیب اور علم دریچے بھی بہت پسند آئے۔ کہانیوں

میں بڑھیا کا انصاف پڑھ کر مزہ آیا۔ نظموں میں علامہ اقبال اور کتاب سے پیار بہت پسند آئیں۔ رفیدہ سحر بنت خلیل الرحمٰن، حیدرآباد۔

* اس بار شیر کا خواب، بلاعنوان کہانی، لڑکی پہاڑ اور جن، پھول نگر، نونہال ادیب، بڑھیا کا انصاف، نونہال مصور، ننھا سہارا اور ہنسی گھر بہت ہی اچھی تحریریں تھیں۔ ان کو پڑھنے سے سبق بھی ملتا ہے اور مزہ بھی آتا ہے۔ ملیحہ یاسمین، کراچی۔

* تمام کہانیاں اچھی تھیں، لیکن سب سے اچھی شیر کا خواب، فرض شناس، لڑکی پہاڑ اور جن کہانیاں تھیں۔ بلاتی میاں نے پھر سے چوروں کو پکڑ وا دیا۔ بلاعنوان کہانی بھی اچھی تھی۔ باقی سب تحریریں بھی اچھی تھیں۔ محسن علی، حسن ابدال، کراچی۔

* جاگو جگاؤ میں شہید حکیم محمد سعید نے لگن اور جستجو سے علم حاصل کرنے پر زور دیا۔ روشن خیالات میں ہمیشہ سب اقوال ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ "علامہ سے وعدہ" کہانی ان بچوں کے لیے سبق آموز ہے جو پڑھائی سے جی چراتے ہیں۔ مسعود احمد برکاتی کی تحریر "دو پرانی چیزیں" پڑھی۔ لائق تحسین تحریر تھی۔ خطاطی کرنا اور سیکھنا مجھے بھی بہت پسند ہے۔ جلد بندی بھی اچھی چیز ہے۔ کتابیں ہماری بہترین اور سچی دوست ہوتی ہیں اور ان کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ "کتاب سے پیار" سب سے اچھی نظم لگی۔ "ننھا سہارا" کہانی بھی اچھی تھی۔ اصل زندگی میں تو ایسے بچے شاید ہی ملیں۔ "بڑھیا کا انصاف" مزے دار کہانی تھی۔ بڑی بی نے سب کی خوب کھنچائی کی۔ شیخ سعدیؒ کی حکمت بھری باتیں بہت پسند آئیں۔ عائشہ محمد خالد قریشی، سکھر۔

* اپریل کا شمارہ قابل مطالعہ اور معلومات سے بھرپور تھا۔ بلاتی میاں کی کہانی ایک بار پھر بازی لے گئی۔ اس بار نظمیں زبردست تھیں۔ بلاعنوان کہانی کا تو جواب ہی نہیں۔ معلومات افزا کے سوالات اس بار آسان تھے۔ لطیفے اس بار اچھے تھے۔ غرض پورا رسالہ آپ کی محنت کا منھ بولتا ثبوت تھا۔ زین علی، کراچی۔

* اپریل کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ جاگو جگاؤ، پہلی بات، دعا (محمد مشتاق حسین قادری)، دو پرانی چیزیں (مسعود احمد برکاتی)، شیر کا خواب (محمد اقبال شمس) اس مہینے کی بہترین تحریریں ہیں۔ بلاعنوان کہانی (محمد شاہد حفیظ) کی تو کیا ہی بات ہے۔ بے چارے چور کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ نظمیں اور معلوماتی مضامین بھی بے حد پسند آئے۔ نور فاطمہ قادری، ایمان فاطمہ قادری، نسیمہ فاطمہ قادری، کاموگی۔

* اپریل کا شمارہ ہمیشہ کی طرح جگ مگ جگ مگ کرتا ملا۔ اول سے آخر تک پورا رسالہ آپ کی محنت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اتنا دل کش اور حسین رسالہ اتنے طویل عرصے سے مسلسل باقاعدگی سے شائع کرنے پر آپ بلاشبہ داد کے حق دار ہیں۔ مشتاق حسین قادری کی حمد سے ایمان کو جلا ملی۔ دو پرانی چیزیں، شیر کا خواب، فرض شناس اور بڑھیا کا انصاف بڑی دل چسپ کہانیاں ہیں۔ بلاعنوان کہانی کی تو کیا ہی بات ہے۔ حسن رضا سردار، کاموگی۔

* اس مہینے کا رسالہ خوب صورت تحریروں کا گلدستہ ہے۔ محمد مشتاق حسین قادری کی "دعا" ایمان افروز ہے۔ اس کے علاوہ دو پرانی چیزیں، شیر کا خواب، فرض شناس اور بڑھیا کا انصاف رسالے کی جان ہیں، لیکن بلاعنوان کہانی سب پر بازی لے گئی۔ حلیمہ نشان، خدیجہ نشان، ام حبیبہ قادری، کاموگی۔

* اپریل کا ہمدرد نونہال زبردست تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، پڑھ کر مزہ آیا۔ لڑکی پہاڑ اور جن اچھی تھی اور باقی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ ہنسی گھر پڑھ کر ہنسی آئی۔ کہانی پھول نگر ہمیں بے حد پسند آئی۔ فرزین اعجاز ملتانی، کراچی۔

* اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ بلاعنوان کہانی بہت اچھی لگی۔ اس کے بعد پہلے نمبر پر بڑھیا کا انصاف، دوسرے نمبر پر لڑکی پہاڑ اور جن اور تیسرے نمبر پر فرض شناس رہی۔ اس کے علاوہ تمام مستقل سلسلے بھی اچھے رہے۔ ہنسی گھر کے تقریباً تمام لطیفے ہی مزے دار تھے۔ پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ نظم علامہ اقبال اور کتاب سے پیار بہت پسند آئی۔ شیر کا خواب کہانی بھی اچھی تھی۔ مسعود اعجاز ملتانی، کراچی۔

* اپریل کا شمارہ پڑھا۔ بہت مزہ آیا۔ خاص طور پر لطیفے بڑے مزے دار تھے۔ کہانیوں میں شیر کا خواب اور بڑھیا کا انصاف زیادہ پسند آئیں۔ طیبہ نور، ثروت جہاں، بسیلہ۔

* اپریل کا شمارہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ دو پرانی چیزیں (مسعود احمد

برکاتی) تحریر بہت اچھی لگی۔ کہانیاں سب سپرہٹ تھیں۔ علامہ سے وعدہ اور شیر کا خواب نمبر ون رہے۔ بلاعنوان کہانی اور بڑھیا کا انصاف بھی لاجواب کہانیاں تھیں۔ **اویس نور گڈانی، بھرپور ماتھیلو۔**

❁ اس ماہ کا شمارہ بہت ہی خوب صورت تھا۔ تمام کہانیاں سپرہٹ تھیں۔ سرورق کچھ زیادہ خوب صورت نہیں تھا۔ **طوبیٰ جاوید انصاری، بہاول نگر۔**

❁ میں ہمدرد نونہال بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس میں بہت دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں ہوتی ہیں۔ **حبیبہ بشریٰ صالحہ، جگہ نا معلوم۔**

❁ اپریل کا شمارہ لاجواب تھا۔ ہر سلسلہ بہترین تھا۔ فرض شناس (جاوید بسام)، بلاعنوان کہانی (محمد شاہد حفیظ)، بڑھیا کا انصاف (عبدالرؤف تاجور) غرض ہر کہانی بہترین تھی۔ ہنسی گھر سمیت ہر سلسلہ دل چسپ اور بہترین تھا۔ معلومات عامہ کا بھی کوئی سلسلہ رکھیں۔ **فہد شاہ، زینب شاہ، مانسہرہ۔**

❁ سب سے پہلے جاگو جگاؤ اور پہلی بات پڑھی۔ اس کے بعد تمام کہانیاں بھی دل چسپ تھیں۔ علامہ سے وعدہ، دو پرانی چیزیں، فرض شناس، لڑکی پہاڑ اور جن، بڑھیا کا انصاف، شیر کا خواب، بلاعنوان کہانی بہت اچھی تھیں غرض تمام سلسلے ہی نرالے تھے۔ **منعم اصغر، ڈیرہ غازی خان۔**

❁ تحریریں سب زبردست تھیں۔ علامہ سے وعدہ، شیر کا خواب، لڑکی پہاڑ اور جن، پھول نگر، بڑھیا کا انصاف اور ننھا سہارا بہت ہی دل چسپ لگیں۔ فرض شناس میاں بلاتی کی پچھلی کہانیوں سے مقابلہ نہ کرسکی۔ دو پرانی چیزیں پڑھ کر ان کی قدر معلوم ہوئی۔ بلاعنوان کہانی کے مقصد کا پتا نہ چلا۔ نظمیں اچھی لگیں۔ **طارق محمود کھوسو، کشمور۔**

❁ ہمدرد نونہال کے تمام سلسلے بہت عمدہ ہیں۔ اپریل کے شمارے میں دعا (محمد مشتاق حسین قادری)، علامہ اقبال (احمد ہمدانی) نظمیں پسندیدہ تھیں۔ کہانیوں میں بلاعنوان کہانی (محمد شاہد حفیظ) لڑکی پہاڑ اور جن (فضیلہ ذکاء بھٹی) مزے دار اور دل چسپ تھیں۔ ہنڈ کلیا ایک مزے دار سلسلہ ہے۔ ہنسی گھر بہت مزاحیہ تھا۔ **ثریا عبدالستار، لاہور۔**

❁ بڑھیا کا انصاف اور شیر کا خواب لاجواب کہانیاں تھیں۔ بلاعنوان کہانی حیرت انگیز تھی۔ دو پرانی چیزیں (مسعود احمد برکاتی) بڑی زبردست تحریر تھی۔ نظم کتاب سے پیار بہت اچھی لگی۔ لطیفے کچھ خاص نہیں تھے۔ **حرا سعید شاہ، جوہر آباد۔**

❁ اپریل کا شمارہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھا۔ تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ بلاعنوان کہانی پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔ **محمد اذعان خان، کراچی۔**

❁ اس بار کا شمارہ بہت کھلکھلاتا ہوا تھا۔ اس میں سب سے اچھی کہانی بلاعنوان کہانی، پھول نگر اور شیر کا خواب تھی۔ **ابوذر صفوان، کراچی۔**

❁ اس بار کا شمارہ بہت ہی عالی شان تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، جب میں ہمدرد نونہال پڑھتی ہوں۔ ساری کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ **شیزہ صفوان، کراچی۔**

❁ اپریل کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانیاں بہت دل چسپ اور معلوماتی تھیں۔ روشن خیالات اور مسعود احمد برکاتی کی پہلی بات پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ لطیفے بوریت کا احساس ختم کردیتے ہیں۔ نظم "کتاب سے پیار" بہت اچھی تھی۔ **سیف اللہ کھوسو، کشمور۔**

❁ اپریل کا شمارہ لاجواب تھا۔ کہانیوں میں بڑھیا کا انصاف پڑھ کر بہت مزہ آیا اور جاگو جگاؤ بھی دل چسپ تھا۔ ہنسی گھر پڑھ کر مزہ ہی آگیا۔ بلاعنوان کہانی پڑھ کر مزہ نہیں آیا، کیوں کہ اتنی خاص نہیں تھی۔ اپریل کے شمارے کی تمام تحریریں بے حد پسند آئیں۔ بیت بازی کے تمام اشعار ہٹ تھے۔ **نام پتا نا معلوم۔**

❁ ننھا سہارا، بڑھیا کا انصاف، شیر کا خواب، لڑکی پہاڑ اور جن کہانیاں اچھی لگیں۔ فرض شناس اور بلاعنوان کچھ خاص نہ لگیں۔ پہلی بات، جاگو جگاؤ اور روشن خیالات سے علم میں اضافہ ہوا۔ غرض یہ کہ پورا نونہال ٹاپ پر تھا۔ ہمدرد نونہال میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ **حمیرہ صابر، کراچی۔**

☆☆☆

معلومات افزا

سلیم فرخی

معلومات افزا کے سلسلے میں حسبِ معمول ۱۶ سوالات دیے جا رہے ہیں۔ سوالوں کے سامنے تین جوابات بھی لکھے ہیں، جن میں سے کوئی ایک صحیح ہے۔ کم سے کم گیارہ صحیح جوابات دینے والے نونہال انعام کے مستحق ہو سکتے ہیں، لیکن انعام کے لیے سولہ صحیح جوابات بھیجنے والے نونہالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر ۱۶ صحیح جوابات دینے والے نونہال ۱۵ سے زیادہ ہوئے تو پندرہ نام قرعہ اندازی کے ذریعے سے نکالے جائیں گے۔ قرعہ اندازی میں شامل ہونے والے باقی نونہالوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ گیارہ سے کم صحیح جوابات دینے والوں کے نام شائع نہیں کیے جائیں گے۔ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ جوابات صحیح دیں اور انعام میں ایک اچھی سی کتاب حاصل کریں۔ صرف جوابات (سوالات نہ لکھیں) صاف صاف لکھ کر کوپن کے ساتھ اس طرح بھیجیں کہ ۱۸- جون ۲۰۱۵ء تک ہمیں مل جائیں۔ کوپن کے علاوہ علاحدہ کاغذ پر بھی اپنا مکمل نام پتا بہت صاف لکھیں۔ ادارہ ہمدرد کے ملازمین / کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔ ☆

۱۔ جانوروں کی بولیاں سمجھنے والے پیغمبر حضرت .... تھے۔ (حضرت داؤدؑ۔ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت عیسیٰؑ)

۲۔ مشہور مسلمان عالم .... کا اصل نام ابوالولید محمد بن احمد بن محمد تھا۔ (ابنِ خلکان۔ ابنِ خلدون۔ ابنِ رشد)

۳۔ سیرتِ رسولؐ پر بغیر نقطوں کی اردو میں لکھی ہوئی کتاب ہادیِ عالمؐ .... کی تصنیف ہے۔
(احتشام الحق تھانوی ۔ بابا عالم سیاہ پوش ۔ مولانا محمد ولی رازی)

۴۔ پاکستان میں زکوٰۃ آرڈیننس ۲۰ جون .... کو نافذ ہوا تھا۔ (۱۹۸۰ء ۔ ۱۹۸۱ء ۔ ۱۹۸۲ء)

۵۔ کراچی یونی ورسٹی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر .... تھے۔
(بی اے ہاشمی ۔ اے بی حلیم ۔ ڈاکٹر آئی ایچ قریشی)

۶۔ .... پاکستان کی پہلی خاتون ہواباز تھیں۔ (بیگم شائستہ اکرام اللہ ۔ شکریہ خانم ۔ ڈاکٹر بلقیس فاطمہ)

۷۔ متحدہ عرب امارات کا دار الحکومت .... ہے۔ (دبئی ۔ ابوظہبی ۔ شارجہ)

۸۔ پرانا مشہور شہر "گولکنڈہ" .... (بھارت) میں ہے۔ (گجرات ۔ حیدرآباد دکن ۔ بنارس)

۹۔ سال کا سب سے طویل دن ۲۱ .... کو ہوتا ہے۔ (مئی ۔ جون ۔ جولائی)

۱۰۔ مصر کے آخری بادشاہ .... تھے۔ (محمد علی پاشا ۔ اسماعیل پاشا ۔ شاہ فاروق)

۱۱۔ نرسنگ کی بانی فلورنس نائٹ انگیل .... میں پیدا ہوئیں۔ (فرانس ۔ سویڈن ۔ اٹلی)

۱۲۔ کھٹمنڈو .... کا دارالحکومت ہے۔ (نیپال ۔ سری لنکا ۔ بھوٹان)

۱۳۔ عبداللہ یامین عبدالقیوم .... کے موجودہ صدر ہیں۔ (مالدیپ ۔ بحرین ۔ لیبیا)

۱۴۔ انسانی جسم کا سب سے بڑا غدہ (گلینڈ) .... ہے۔ (لبلبا ۔ پتّا ۔ جگر)

۱۵۔ اردو زبان کا ایک محاورہ ہے: ''جان نہ پہچان، بڑی .... سلام۔'' (اماں ۔ خالہ ۔ آپا)

۱۶۔ مومن خاں مومن کے اس شعر کو مکمل کیجیے:

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ آخری .... میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

(عمر ۔ وقت ۔ لمحے)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۲۳۴ (جون ۲۰۱۵ء)

نام : ____________________

پتا : ____________________

____

____

کوپن پر صاف صاف نام، پتا لکھیے اور اپنے جوابات (سوال نہ لکھیں، صرف جواب لکھیں) کے ساتھ لفافے میں ڈال کر دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۷۴۶۰۰ کے پتے پر اس طرح بھیجیں کہ ۱۸۔ جون ۲۰۱۵ء تک ہمیں مل جائیں۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام لکھیں اور صاف لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر جوابات کے صفحے پر چپکا دیں۔

کوپن برائے بلاعنوان انعامی کہانی (جون ۲۰۱۵ء)

عنوان : ____________________

نام : ____________________

پتا : ____________________

____

یہ کوپن اس طرح بھیجیں کہ ۱۸ ۔ جون ۲۰۱۵ء تک دفتر پہنچ جائے۔ بعد میں آنے والے کوپن قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام اور ایک ہی عنوان لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر کاپی سائز کے کاغذ پر درمیان میں چپکایئے۔

نونہال بک کلب

کے ممبر بنیں اور اپنی ذاتی لائبریری بنائیں

بک کلب کا ممبر بننے کے لیے بس ایک سادہ کاغذ پر اپنا نام،
پورا اپنا صاف صاف لکھ کر ہمیں بھیج دیں، آپ کو نونہال بک کلب کا ممبر بنا لیا جائے گا
اور ممبر شپ کے کارڈ کے ساتھ کتابوں کی فہرست بھی بھیج دیں گے۔

ممبر بننے کی کوئی فیس نہیں ہے۔

ممبر شپ کارڈ کی بنیاد پر آپ نونہال ادب کی کتابوں کی خریداری پر

۲۵ فی صد رعایت حاصل کر سکتے ہیں۔

جو کتابیں منگوانی ہوں، ان کے نام، اپنا پورا صاف پتا اور ممبر شپ کارڈ نمبر لکھ کر بھیجیں اور
رجسٹری فیس کی رقم اور کتابوں کی قیمت منی آرڈر کے ذریعے سے
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی
کے پتے پر بھیج دیں۔ آپ کے پتے پر ہم کتابیں بھیج دیں گے۔

کم سے کم ایک سو روپے کی کتابیں منگوانے پر
رجسٹری فیس ممبروں سے نہیں لی جائے گی

ان کتابوں سے لائبریری بنائیں، کتابیں خود بھی پڑھیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی پڑھوائیں۔

علم کی روشنی پھیلائیں

☆ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی۔ ۷۴۶۰۰

عُقاب

تمثیلہ زاہد

ہمارے ملک پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ یہاں ریگستانوں، پہاڑوں، جنگلوں، میدانوں اور ساحلوں میں جہاں طرح طرح کے پرندے پائے جاتے ہیں، وہاں عُقاب، شکرے اور شاہینوں کی بھی کئی قسمیں موجود ہیں۔ عقاب کی ایک قسم ''سنہری عُقاب'' کو پاکستان میں خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔ ان سنہری عقابوں کی نسل تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان عقابوں کا زیادہ شکار کرنا ہے۔

چکوروں، چڑیوں، کوؤں اور دوسرے پرندوں کی طرح عقاب جُھنڈ میں نہیں رہتے ہیں۔ ان کا ٹھکانا پہاڑوں اور وادیوں میں ہوتا ہے۔ عقاب عام پرندوں کی طرح گھونسلا نہیں بناتے۔ یہ آزاد فضا میں رہتے ہیں اور ان کا ٹھکانا پہاڑی علاقے ہی ہیں۔ جنگلی چوہے عقاب کی پسندیدہ غذا ہیں۔ عقاب کا شکار کرنے کے لیے شکاری انہی جنگلی چوہوں کی مدد سے عقاب کا شکار کرتے ہیں۔ بلوچستان میں کئی لوگوں نے عقاب کے شکار کو روزگار کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔ بیرونی ممالک، خاص طور پر عرب کے امیروں کے لیے لاکھوں رپے میں عقاب خریدنا ایسا ہی ہے، جیسے ہمارے ہاں عیدِ قرباں پر قربانی کے لیے بکرا خریدنا۔ ایک عقاب پر پانچ سے دس لاکھ رپے خرچ کرنا، ان کے لیے معمولی بات ہے۔

عقاب کا شکار کرنا آسان نہیں ہے۔ عقاب پکڑنے والے ماہر شکاری طویل

عرصے پہاڑوں پر گزار دیتے ہیں، تب کہیں جا کر عقاب کا شکار کرنے میں کام یابی حاصل ہوتی ہے۔ عقاب کا شکار کرنے کے لیے سب سے پہلے شکاری، جنگلی چوہوں کو پکڑتے ہیں، پھر ان کے پاؤں میں ریشمی ڈور کے ذریعے سے سیسے کی بھاری گولیاں باندھ دیتے ہیں، پھر ان جنگلی چوہوں کو پہاڑوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شکاری کچھ فاصلے پر بیٹھ کر دوربین کے ذریعے سے جائزہ لیتا رہتا ہے۔ آسمان پر اُڑتا ہوا عقاب ان چلتے پھرتے چوہوں کو آسان شکار سمجھ کر اپنی اُڑان نیچی کر لیتا ہے اور موقع پا کر ان پر جھپٹتا ہے۔ اس دوران عقاب کے پنجے ریشمی ڈور سے اُلجھ جاتے ہیں۔ سیسے کی بھاری گولیوں کی وجہ سے عقاب کو اُڑان بھرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ عقاب کی اسی اُلجھن سے فائدہ اُٹھا کر شکاری اپنا جال تیزی سے عقاب پر پھینک دیتا ہے۔ یوں شکاری اپنی مہارت سے عقاب کو پکڑنے میں کام یاب ہو جاتا ہے اور وہ ان عقاب کی بھاری قیمت وصول کرتا ہے۔

پرندے کرۂ ارض کی سلامتی کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک مخصوص نظام ہے، جسے اُس نے ہماری زندگی کے لیے قائم کر رکھا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر پرندے مکمل طور پر ختم ہو جائیں تو حشرات الارض کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ فصلیں اور درخت تباہ ہونے لگیں گے۔ اس نظام کو برقرار رکھنے کے لیے پرندوں کا وجود ضروری ہے۔ قدرت کے اس نظام کی حفاظت کرنا ہماری بھی اولین ذمے داری ہے۔ ضروری ہے کہ پرندوں کی حفاظت کی جائے۔ عقاب ایک قیمتی پرندہ ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ پہاڑوں اور وادیوں کا حسن ان پرندوں سے آباد رہے۔ ☆

جوابات معلومات افزا - ۲۳۲

سوالات اپریل ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئے تھے

اپریل ۲۰۱۵ء میں معلومات افزا-۲۳۲ کے جو سوالات دیے گئے تھے، ان کے جوابات ذیل میں لکھے جا رہے ہیں۔ ۱۶ صحیح جوابات بھیجنے والے نونہالوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے ان سب نونہالوں کے درمیان قرعہ اندازی کر کے انعام یافتہ نونہالوں کو ایک کتاب بھیجی جا رہی ہے۔ باقی نونہالوں کے نام شائع کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ حضرت موسیٰؑ کی اہلیہ کا نام حضرت صفورا تھا۔
۲۔ حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا تھا۔
۳۔ اندلس میں بنی اُمیہ کے پہلے حکمران عبدالرحمٰن اول تھے۔
۴۔ گوادر ۱۹۵۸ء میں پاکستان کا حصہ بنا تھا۔
۵۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی پہلی خاتون گورنر ڈاکٹر شمشاد اختر تھیں۔
۶۔ کراچی میں پاکستان اسٹیل ملز کا سنگ بنیاد ذوالفقار علی بھٹو نے رکھا تھا۔
۷۔ منگو خان، قبلائی خان، ہلاکو خان اور ادیق بوغا، چنگیز خان کے پوتے تھے۔
۸۔ مشہور ادیب جارج برنارڈ شا کی پیدائش ۱۸۵۶ء میں آئرلینڈ میں ہوئی۔
۹۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر جرمنی کا چانسر بنا۔
۱۰۔ پاکستان کے پہلے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر تھے۔
۱۱۔ کاسابلانکا مراکش کا ایک شہر ہے۔
۱۲۔ مشہور شاعر محشر بدایونی کا اصل نام فاروق احمد تھا۔
۱۳۔ ''طاؤس'' عربی زبان میں مور کو کہتے ہیں۔
۱۴۔ پاکستان کا موجودہ آئین ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو منظور ہوا تھا۔
۱۵۔ اردو زبان کا ایک محاورہ ہے ''بھاگتے چور کی لنگوٹی۔''
۱۶۔ مرزا غالب کے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح درست ہے۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

قرعہ اندازی میں انعام پانے والے پندرہ خوش قسمت نونہال

☆ **کراچی:** محمد حماد بٹ، عبدالرحمٰن اظفر، ایمن صدیقی، محمد صہیب علی، مریم سہیل ☆ **لاہور:** سیدہ سدرہ الیاس، انشراح خالد بٹ ☆ **میر پور خاص:** مظفر احمد شیخ ☆ **حیدر آباد:** عمیر بن حزب اللہ بلوچ ☆ **پشاور:** محمد حمدان ☆ **خانیوال:** احمد ابراہیم حسن ☆ **ملتان:** احمد عبداللہ ☆ **اسلام آباد:** خولہ فاروق ☆ **فیصل آباد:** محمد عبداللہ ضیا ☆ **ایبٹ آباد:** حامد نسیم۔

١٦ درست جوابات دینے والے نونہال

☆ **کراچی:** اسریٰ خان، عالیہ ذوالفقار، عریشہ جبار، علیزہ عبداللہ، سید حسن علی، فہد فدا حسین کیریو، محمد بلال مصطفیٰ قریشی، انظر سعید، صدف احمد، سید محمد انس، سید احمر وقار، محمد فواد بٹ ☆ **لاہور:** صفی الرحمٰن، مطیع الرحمٰن ☆ **سانگھڑ:** فائزہ نوید انصاری، محمد ثاقب منصوری ☆ **اٹک:** اسما عثمان، عمیرہ عدیل ☆ **راولپنڈی:** شرجیل ضیا، محمد ارسلان ساجد ☆ **میر پور خاص:** عائشہ مہک، شہزیم راجا، وقار احمد ☆ **حیدر آباد:** عائشہ ایمن عبداللہ، محمد عاشر راحیل، نسرین فاطمہ، عبدالمعید ☆ **کوٹلی:** زرفشاں بابر ☆ **تلہ گنگ:** عاطف ممتاز ☆ **کاموکے:** محمد حسنات حمید ☆ **بہاول پور:** مبشرہ حسین ☆ **سکھر:** عائشہ محمد خالد قریشی ☆ **ٹنڈو اللہ یار:** محمد فیروز ابراہیم ☆ **خوشاب:** محمد قمر الزماں۔

١٥ درست جوابات بھیجنے والے سمجھ دار نونہال

☆ **کراچی:** ناعش بن عمران، محمد بلال عبدالرب، اختر حیات، بہادر، عمر حیات، معصومہ مناہل، فوزیہ عنبرین، زینب زاہد، ناعمہ تحریم، حفظہ مجی، رضی اللہ خان، شاہ محمد ازہر عالم، علیزہ سہیل، سیدہ مریم محبوب، سیدہ سالکہ محبوب، سید شہظل علی اظہر، سید باذل علی اظہر، محمد آصف انصاری، سیدہ جویریہ جاوید، سید عفان علی جاوید، کاشف ظفر، طالب حیدر، یوسف کریم، اسما زیب عباسی، عائشہ کریم ☆ **حیدر آباد:** سید محمد بُریر حیدر، ماہ شر فاطمہ، حیان کاشف ☆ **بھکر:** عائشہ کشف، مصباح بتول، نگار گل ☆ **راولپنڈی:** محمد اسماعیل ☆ **جعفر آباد:** محمد زبیر کھوسہ ☆ **فیصل آباد:** محمد اواب کمبوہ ☆ **لاڑکانہ:** معتبر خان ابڑو ☆ **بے نظیر آباد:** فروا سعید خانزادہ ☆ **کشمور:** سیف اللہ

کھوسو ☆ بدین: ماہ نور فاروق ☆ سکھر: فلزا مہر ☆ وزیر آباد: سلمیٰ فرحت ☆ ڈگری: محمد طلحہٰ مغل ☆ پشاور: حانیہ شہزاد ☆ گوادر: معصومہ اقبال۔

۱۴ درست جوابات بھیجنے والے علم دوست نونہال

☆ کراچی: عبدالودود، مہک عمران، بنتِ شفیق اجمل، یاسر نوشاد کامل، محمد احمد حسین، فضل قیوم خان، فضل ودود خان، محمد بلال، طلحہٰ سلطان شمشیر علی، معین الدین غوری، احسن محمد اشرف، محمد جلال الدین اسد، طاہر مقصود، حماد عاصم، رخشی آفتاب، عائشہ قیصر، آمنہ افراسیاب، زین علی ☆ جام شورو: حافظ معصب سعید، حافظ عمر سعید ☆ لاوا: محمد طارق جمیل ☆ کشمور: عبدالغفار بلوچ ☆ اسلام آباد: اقدس فاطمہ ☆ حیدر آباد: حرا حسن، صبیحہ محمد عامر قائم خانی ☆ راولپنڈی: محمد مجتبیٰ اسلم ☆ قصور: عبدالرحمٰن ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل ☆ شیخوپورہ: محمد احسان الحسن۔

۱۳ درست جوابات بھیجنے والے محنتی نونہال

☆ کراچی: صہیب آدھمی، محمد فہد الرحمٰن، رضوان ملک امان اللہ، احتشام شاہ، صفی اللہ، علیزہ نوید، مناہل کامران، منیزہ خان، فاروق احمد صدیقی، مسعود اعجاز ملتانی ☆ حیدر آباد: غلام شہباز محمد عمر ☆ میر پور ماتھیلو: اویس نور گڈانی ☆ اوتھل: حدیقہ نار ☆ تلہ گنگ: اسامہ خباب علی ☆ کشمور: طارق محمود کھوسو ☆ نوشہرو فیروز: ریان آصف خانزادہ راجپوت ☆ بہاول نگر: طوبیٰ جاوید انصاری ☆ فیصل آباد: زینب ناصر۔

۱۲ درست جوابات بھیجنے والے پُر امید نونہال

☆ کراچی: محمد عثمان خان، سندس آسیہ ☆ نواب شاہ: ثوبیہ رانی محمد رمضان مغل ☆ بیلا: محمد الیاس چنا ☆ وہاڑی: حافظ تحریم فاطمہ ☆ ہڈالی: نعیم اللہ ☆ ملتان: محمد طلال صفدر ☆ لاہور: عبدالجبار رومی انصاری، امتیاز علی ناز۔

۱۱ درست جوابات بھیجنے والے پُر اعتماد نونہال

☆ کراچی: رمشا صابر، سید اویس عظیم علی ☆ کاموکی: نفیسہ فاطمہ قادری، حسن رضا سردار، خدیجہ نشان ☆ تربت: صباح عبدالحمید ☆ بھکر: محمد مجیر خان ☆ مرید کے: بشریٰ رانا کرکٹر ☆ رحیم یار خان: کنزا سہیل ☆ راولپنڈی: منیبا حسین۔

☆

دنیا کے نامور ادیبوں کے حالاتِ زندگی پر معلوماتی کتابیں

حسن ذکی کاظمی کے قلم سے

ولیم شیکسپیئر انگریزی ادب کے عظیم ڈراما نگار شیکسپیئر کے حالاتِ زندگی، جس کے ڈرامے ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔ یہ کتاب اس کے کارناموں سے واقف کرانے میں بہت مددگار ہے۔

شیکسپیئر کی تصویر کے ساتھ خوب صورت ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۲۵ روپے

سیموئل ٹیلر کولرج انگریزی کے اس عظیم شاعر نے محنت، شوق اور صلاحیتوں سے خود علم سیکھا اور شعروادب کی دنیا میں اپنا اہم مقام بنایا۔ اس کتاب میں اس کے حالاتِ زندگی دیے گئے ہیں۔

کولرج کی تصویر کے ساتھ خوب صورت ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۳۵ روپے

ولیم ورڈز ورتھ ورڈ ورتھ نے انگریزی شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ سانیٹ بھی لکھے اور مضامین بھی۔ اس کتاب میں اس کی زندگی کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

ولیم ورڈز ورتھ کی تصویر کے ساتھ خوب صورت ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۳۵ روپے

برونٹے سسٹرز تین برونٹے بہنوں نے اپنی شاعری اور ناولوں کے ذریعے سے عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ یہ ایک دل چسپ، معلوماتی کہانی ہے، جو اس کتاب میں پڑھیے۔

برونٹے بہنوں کی خوب صورت تصویر کے ساتھ رنگین ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۴۵ روپے

چارلس ڈکنز عظیم ناول نگار جسے کتابیں پڑھنے کے شوق نے دنیا کے نامور ادیب کا اعلا مقام عطا کیا۔

ٹائٹل پر ڈکنز کی خوب صورت تصویر صفحات : ۲۴ قیمت : ۴۵ روپے

ٹامس ہارڈی انگریزی کا پہلا ناول نگار جس نے گاؤں کی حقیقی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

ہارڈی کی تصویر سے سجا ٹائٹل صفحات : ۲۴ قیمت : ۴۵ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی۔ ۷۴۶۰۰

بلاعنوان کہانی کے انعامات

ہمدرد نونہال اپریل ۲۰۱۵ء میں جناب **محمد شاہد حفیظ** کی بلاعنوان انعامی کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کے بہت اچھے اچھے عنوانات موصول ہوئے۔ کمیٹی نے بہت غور کرنے کے بعد تین بہترین عنوانات کا انتخاب کیا ہے، جو مختلف جگہوں سے پانچ نونہالوں نے ارسال کیے ہیں، جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

۱۔ چور خود لُٹ گیا : شاہ بشریٰ عالم، کراچی

۲۔ استادوں کے استاد : (۱) حسن جہانگیر، راولپنڈی
(۲) کنول فدا حسین کیریو، کراچی

۳۔ چور کا بھائی : (۱) محمد شکیب مسرت، بہاول پور
(۲) : محمد مصعب علی، کراچی

چند اور اچھے اچھے عنوانات

چور پر مور۔ جیسے کو تیسا۔ سیر کو سوا سیر۔ چور کے پیچھے چور۔ شکاری ہوا شکار۔
نادان چور۔ چور مچائے شور۔ اناڑی چور۔ چوروں کے چور

ان نونہالوں نے بھی ہمیں اچھے اچھے عنوانات بھیجے

☆ **کراچی:** شازیہ انصاری، عائشہ اسرار خان، عبدالرحمٰن اظفر، علیزہ نوید، زوبیہ سعید عالم، صبا واحد، محمد عمر عبدالرشید، اعراف نعیم الدین انصاری، مشعل نایاب، رضی اللہ خان، یاسر نوشاد کامل، اسد عارف، محمد شافع، بنتِ شفیق اجمل، محمد بلال صدیقی، حفظہ حجی، محمد بلال مصطفیٰ

قریشی، یسریٰ حسین، محمد اختر، سید اعظم مسعود، زیان بن نعمان، لبنیٰ جبیں، محمد احمد رضا خان، محمد انس زاہد، سید اویس عظیم علی، مہک عمران، نازش احمد، عبدالودود، نبیہہ فیصل، ناعمہ تحریم، سید حسن علی، مسعود اعجاز ملتانی، اسما زیب عباسی، محمد حماد بٹ، سید عفان علی جاوید، عبدالرحمٰن فرید، مناہل کامران، محمد بلال عبدالرب، نسرین عزیز، مہرین عزیز، زہیر ذوالفقار، مناہل آفتاب، عریشہ جبار، مصامص شمشاد غوری، زین علی، آمنہ افراسیاب، صبا عبدالغنی، ماہم عبدالصمد سموں، اسریٰ خان، عریشہ حبیب الرحمٰن، علینہ وسیم اظہر، رمشا صابر، سید باذل علی اظہر، سیدہ مبشرہ نقوی، اقرا خالد، حرا اسلم، ماہ رخ آفتاب، نور فاطمہ، آمنہ قیصر، لاحبہ بتول، حسن شہاب صدیقی، طالب حیدر، انعم خان، بشریٰ رؤف، اسد اللہ، رضوان ملک امان اللہ، بہادر، طلحہٰ سلطان شمشیر علی، محمد فہد الرحمٰن، احسن محمد اشرف، معین الدین غوری، محمد بلال بن عامر، محمد عثمان خان، محمد جلال الدین اسد، طاہر مقصود، عمر حیات، اختر حیات، فضل ودود خان، فضل قیوم خان، صفی اللہ، صدف احمد، ایان علی، احتشام شاہ، احمد حسین، طہور اعدنان، علینا اختر، مریم سہیل، سیدہ سالکہ محبوب، سیدہ مریم محبوب، سید شہظل علی اظہر، عارج الایمان، فاروق احمد صدیقی، یمنیٰ کریم، افراح کلیم صدیقی، ایمان عقیل، سیدہ جویریہ جاوید، انعم صابر، مریم عامر، سیدہ وجیہہ ناز، ابوزر صفوان، تابندہ آفتاب، عبدالوہاب زاہد محمود، عبدالسمیع محمد ایوب، ہانیہ حبیب ☆ **ملتان:** اُمِ مریم، حسان علیم، محمد طلال صفدر، ایمن فاطمہ، دانیال سلطان ☆ **نواب شاہ:** ثوبیہ رانی محمد رمضان مغل، ارم بلوچ محمد رفیق ☆ **اسلام آباد:** خولہ فاروق، فائقہ شبیر، ثمن زاہد، ریان سہیل ☆ **راولپنڈی:** منیب صبا، حفصہ کامران، زینب ☆ **حیدرآباد:** محمد طلحہٰ، حیان کاشف، عائشہ ایمن عبداللہ، محمد حسان چوہان، رمیصا

حزب اللہ بلوچ، سید اقرا اعجاز، شیروینہ ثنا، عبدالمعید ☆ **فیصل آباد:** محمد عبداللہ ضیا، زینب ناصر، اصفیٰ بتول ☆ **میر پور خاص:** مریم کھٹیان، توقیر، فیضان احمد خان، بلال احمد، محمد طلحہٰ مغل، عتیق الرحمٰن، شہزیم راجا ☆ **جامشورو:** حافظہ خدیجہ سعد، حافظ مصعب سعید ☆ **چکوال:** عاقب جنید، عاطف ممتاز، احسن نوید ☆ **لاہور:** انشراح خالد بٹ، حافظ محمد عبداللہ، نمیرہ مسعود، امتیاز علی ناز، سیدہ سدرہ الیاس، عبدالجبار رومی انصاری، ماہین صباحت، عطیہ جلیل، جواد الحسن ☆ **سکھر:** عائشہ محمد خالد قریشی، صفوان شاہ، بشریٰ محمد محمود شیخ، فلزا مہر ☆ **سانگھڑ:** فائزہ نوید انصاری، اقصیٰ انصاری جھول ☆ **کشمور:** سیف اللہ کھوسو، طارق محمود کھوسو ☆ **لسبیلہ:** صلاح الدین، محمد الیاس چنا ☆ **ٹنڈو الہٰ یار:** ہانیہ ارشد، محمد فراز ابراہیم ☆ **کامونکی:** خدیجہ نشان، حسن رضا سردار، نفیسہ فاطمہ قادری ☆ **پشاور:** محمد حیان، حانیہ شہزاد ☆ **قصور:** عبدالرحمٰن، عبدالمعیز ☆ **ڈیرہ اللہ یار:** آصف علی کھوسہ ☆ **خوشاب:** محمد قمرالزماں، حرا سعید شاہ ☆ **تربت:** صباح عبدالجید ☆ **بہاول نگر:** طوبیٰ جاوید انصاری ☆ **میر پور ماتھیلو:** اویس نور گڈانی ☆ **سرگودھا:** زاہد خورشید ☆ **ٹیکسلا:** ملک مدثر اعوان ☆ **شہداد پور:** مسکان محمد حسین ☆ **بھکر:** ملک محمد معید اسلم، محمد مجیر خان ☆ **ڈیرہ غازی خان:** منعم اصغر ☆ **رحیم یار خان:** کنزا سہیل ☆ **شیخوپورہ:** محمد احسان الحسن، محمد ریان ☆ **شیخوپورہ:** محمد احسان الحسن، محمد ریان ☆ **ٹوبہ ٹیک سنگھ:** سعدیہ کوثر مغل، عمیر مجید ☆ **نوشہرہ:** سلمیٰ محسن علی ☆ **بے نظیر آباد:** فردا سعید خانزادہ ☆ **لاڑکانہ:** معتبر خان ابڑو ☆ **ٹھاروشاہ:** شایان آصف خانزادہ راجپوت ☆ **مریدکے:** عروج رانا ☆ **کوہاٹ:** بریرہ سمیع ☆ **اٹک:** اسماعثمان، ہاجرہ عدیل ☆ **کوٹلی:** محمد جواد چغتائی ☆ **پتا نامکمل:** محمد احمد، حارث علی خان، اُم رومان، مظفر احمد شیخ، نعیم اللہ، ہڈالی۔

نونہال لغت

لفظ	تلفظ	معنی
ہَونَّق	ہَ وَ نْ نَ ق	احمق۔ بے وقوف۔
جِدّت	جِ دْ دَ ت	نیا پن۔ تازگی۔
لَجاجت	لَ جا جَ ت	خوشامد۔ منت۔ عاجزی۔ بھوک سے تڑپنا۔
اِشراق	اِ شْ رَ ا ق	سورج نکلنے کا وقت۔ وہ نماز جو سورج نکلنے کے وقت پڑھی جاتی ہے۔
لَحظہ	لَ حْ ظَہ	پل۔ لمحہ۔ پلک جھپکنے کا عرصہ
وَالہانہ	وَ ا لِ ہا نہ	شیفتگی کے انداز سے۔ عاشقانہ انداز سے۔
دَرمان	دَ رْ ما ن	علاج۔ دوا دارو۔ چارہ۔
اِعتدال	اِ عْ تِ دا ل	برابر۔ نہ کمی، نہ زیادتی۔ تناسب۔ میانہ روی۔
خَوانچہ	خَ وَ ا نْ چہ	چھوٹا خوان۔ وہ خوان جس میں پکی ہوئی مختلف چیزیں رکھ کر پھیری لگا کر بیچتے ہیں۔ وہ مٹی کی رکابی جس میں فرنی جماتے ہیں۔
حِلم	حِ لْ م	بردباری۔ تحمل۔ برداشت۔ نرمی۔ نرم دلی۔
سَوغات	سَ وْ غا ت	تحفہ۔ ہدیہ۔ عمدہ چیز۔ نرالی چیز۔
مُنفرد	مُ نْ فَ رِ د	اکیلا۔ تنہا۔ یکتا۔ واحد۔
دَرپردہ	دَ رْ پَ رْ دَ ہ	خفیہ طور پر۔ پوشیدہ۔ غائبانہ۔ پیٹھ پیچھے۔
دَست کار	دَ سْ تْ کا ر	کاریگر۔ وہ شخص جس کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہو۔
رَوارَوی	رَ وَ ا رَ وِ ی	بھاگ دوڑ۔ عجلت۔ سرسری پن۔

پُراسرار غار اور دوسری کہانیاں
تحریر: مسعود احمد برکاتی
جاگو جگاؤ

فہرست

سن اشاعت: ۲۰۱۵ء

قیمت : ۲۰ رپے

اَلسّلام علیکم

ایک بزرگ تھے۔ بازار میں ان کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا، لیکن وہ اکثر شام کے وقت بازار چلے جایا کرتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ بازار کیوں جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، اس لیے جاتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سلام کرسکوں اور جواب میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا سلام لے سکوں۔ آپ اگر کسی کو بھولے سے سلام کیے بغیر آگے بڑھ جاتے تو پلٹ کر آتے اور سلام کرتے۔ یہ بزرگ تھے حضرت عبداللہؓ ابن عمر فاروق۔

اس واقعے سے سلام کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ سلام کے معنی ہیں سلامتی۔ جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو کہتے ہیں:

السلام علیکم یعنی تم پر سلامتی ہو۔

سلام عربی لفظ ہے اور اس کے بہت سے معنی ہیں: سلامتی، دعا، امن، امان، سالم، تسلیم، بندگی، آداب، کورنش۔

جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی سلامتی، اس کی بھلائی کی دعا کرتے ہیں۔ ہمارے سلام کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہم نے سلام کیا کیا ہم اُسے جانتے ہیں، چاہے معمولی طور پر ہی جانتے ہوں اور اس کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اُس شخص پر ہمارا اچھا جذبہ، اچھی خواہش ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے اُس شخص کو سکون ملتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی بھلائی چاہنے والے بھی

ہیں۔ اس طرح ہم باہم اُنس اور پیار بڑھتا ہے۔ محبت کی فضا بنتی ہے۔ یہ محبت کی فضا بڑی ضروری اور کام کی چیز ہے۔ اس سے انسان، انسان میں قربت بڑھتی ہے۔ ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں۔ دیکھا آپ نے سلام کا ایک لفظ کتنے کام کرتا ہے، لیکن سلام صرف ایک لفظ ہی نہیں ایک جذبہ ہے، ایک مزاج ہے۔ یہ جذبہ ترقی کرتا ہے تو معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ یہ مزاج معاشرے کو سکون، راحت اور خوشی عطا کرتا ہے۔ معاشرہ بہت سے انسانوں کے مجموعے سے بنتا ہے۔ معاشرہ چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ سب سے چھوٹا معاشرہ خاندان کہلاتا ہے۔ اس سے بڑے معاشرے کو برادری کہہ سکتے ہیں۔ پھر شہر اور ملک آتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا ایک معاشرہ ہوتا ہے۔ جس خاندان جس برادری اور جس قوم کے لوگ ایک دوسرے کے سچے دوست اور بھائی ہوں، ان کا معاشرہ بڑے امن اور چین سے رہتا ہے اور خوب پھلتا پھولتا ہے۔

دونوں جہانوں کے سردار اور ہمارے پیارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”تم لوگ جنت میں نہیں جا سکتے جب تک کہ مومن نہیں بنتے اور تم مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ میں تمھیں وہ تدبیر کیوں نہ بتا دوں جس کو اختیار کر کے تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو۔ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔“

یعنی سلام کو پھیلانے سے محبت بڑھے گی۔ محبت مومن ہونے کی نشانی ہے اور جنت کا راستہ کھولتی ہے، بلکہ دنیا کو بھی جنت بناتی ہے۔ آپؐ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

"جب تم گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو اور جب تم گھر سے باہر جاؤ سلام کر کے رخصت حاصل کرو۔"

آپؐ کا یہ ارشاد بھی سونے سے لکھے جانے کے قابل ہے:

"غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور ہر مسلمان کو سلام کرو، چاہے تمھاری اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔"

ہر مسلمان کو سلام کرنے کی ہدایت کر کے آپؐ نے محبت اور مساوات (برابری) کی تعلیم دی ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایک دوسرے کی سلامتی اور بھلائی چاہنا اُن کا فرض ہے۔

حضورؐ کا ایک اور ارشاد پڑھیے:

"وہ آدمی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔" خود حضورؐ کا طریقہ کیا تھا؟ آپ کا طریقہ یہ تھا:

آپؐ کے پاس جو شخص بھی آتا آپؐ اس کو سلام کرنے میں پہل فرماتے۔ آپؐ کی کوشش ہوتی کہ اس سے پہلے کہ کوئی شخص آپؐ کو سلام کرے، آپؐ پہلے اس پر سلامتی بھیج دیں۔ آپؐ اس طرح سلام کرتے تھے:

اَلسّلام علیکم وَ رَحمتہ اللہ

ایک دن آپؐ مسجد کے پاس سے گزرے۔ وہاں کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، آپؐ نے اُن کو اپنے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا، "السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!"

آپؐ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: اس شخص کو تیس نیکیاں ملیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ السلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام ہے، یعنی ''اور تم پر بھی سلامتی ہو۔'' لیکن اگر کوئی جواب میں ورحمتہ اللہ (اور اللہ کی رحمت ہو) کے الفاظ بڑھادے تو اچھا ہے اور ''وبرکاتہ'' (اور برکتیں بھی نازل ہوں) جواب میں شامل کرلے تو کیا کہنے۔ اس طرح اس کی خوش دلی زیادہ ظاہر ہوگی۔

سلام تہذیب کی علامت بھی ہے۔ جو آدمی سلام کرتا ہے وہ مہذب کہلاتا ہے اور لوگ اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ سلام کرنے میں ایک آسانی بھی ہے۔ آدمی کے پاس ہمیشہ اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ کسی جاننے والے سے رُک کر بات چیت کرے، لہٰذا وہ سلام کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ سلام کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے پہنچاتے ہیں اور آپس میں ناراض نہیں ہیں، خوش ہیں۔ دو جاننے والوں کا آمنا سامنا ہوا اور وہ وقت کی کمی کی وجہ سے بات چیت نہ کرسکیں، ویسے ہی گزر جائیں تو شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں دِلوں میں فرق تو نہیں آ گیا۔ سلام کرنے سے یہ شبہ ہوتا اور ذہن صاف رہتا ہے۔

اب ذرا اردو میں سلام کے معنی اور محاورے بھی دیکھیے۔ سلام عربی لفظ ہے اور اس کے معنی بھی میں نے اوپر لکھ دیے ہیں، لیکن اردو بھی ایک بڑی اور مستقل زبان ہے۔ ہر زبان دوسری زبان سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے بعض لفظ اپنا بھی لیتی ہے، لیکن مستقل اور زندہ زبان کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبان کے لفظ تو لیتی ہے، لیکن ان کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مشکل ہی سے کسی لفظ کو جوں کا توں قبول کرتی ہے۔ کہیں زیر زبر بدل دیتی ہے کہیں معنی بدل دیتی ہے اور کہیں اس کے

ساتھ اپنا کوئی لفظ لگا کر نئے معنی پیدا کرتی ہے۔ لفظ سلام کے ساتھ بھی اردو نے کچھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ عربی میں سلام کے جو معنی ہیں ان کے ساتھ ساتھ اردو میں کئی معنی ایسے بھی ہیں جو عربی میں نہ ہوں گے، مثلاً اردو میں سلامتی کے علاوہ الزام دینے کے لیے بھی سلام کہتے ہیں۔ اسی طرح کے چند اور محاورے اور ان کا مفہوم لکھتا ہوں:

سلام پھیرنا : نماز ختم کرنا

سلام پیام : بات چیت۔ منگنی یا شادی کے سلسلے میں بات چیت۔

سلام دینا : دُور کرنا، رخصت کرنا۔

سلام کرنا : آداب کرنا، رخصت ہونا۔ کسی کام کو چھوڑنے کے معنی میں بھی سلام کرنا بولتے ہیں جیسے داغ نے اس شعر میں لکھا ہے:

تھی نہ تابِ ستم تو حضرتِ دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

کسی کی مہارت یا قابلیت کا قائل ہو جانا۔

سلام لینا : سلام کا جواب اشارے یا زبان سے دینا۔ میل ملاپ چھوڑنے کے معنی میں بھی سلام لینا بولتے ہیں۔

سلام ہونا : ملاقات ہونا۔

سلام ہے : ہم باز آئے۔ معاف کیجیے۔ اللہ محفوظ رکھے، اللہ کام نہ ڈالے۔

سلام نیاز : عاجزی کا سلام۔

سلام روستائی: غرض مندی کا سلام۔

سلام : ایک قسم کی تعریفی نظم کو کہتے ہیں، جو غزل کے انداز پر ہوتی ہے اور جس میں حضورؐ کی سیرت یا واقعہ کربلا کا ذکر ہوتا ہے۔

سلام پڑھنا : میلاد میں حضورؐ پر منظوم سلام پڑھنا۔

سلام بھیجنا : درود اور سلام پڑھنا۔

☆☆☆

پراسرار غار

سمندر کی لہریں بہت زور شور سے ساحل سے آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ سونی کھڑکی میں بیٹھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی تینوں بہنیں شوشو، سومو اور ماشا ایک طرف کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ یہ بہنیں اپنی خالہ کے پاس ایک جزیرے میں چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھیں۔ خالہ کا مکان جزیرے میں سمندر کے کنارے تھا، کیوں کہ ان کے خالو مچھلیوں کے بڑے ٹھیکے دار تھے اور مدت سے یہیں رہتے تھے۔ یہ چاروں بہنیں دن بھر ساحل پر کھیلتی رہتی تھیں اور دور سمندر سے گزرنے والے جہازوں، کشتیوں اور مچھلیاں پکڑنے والوں کو دیکھا کرتیں۔

ان کی خالہ نے انھیں نصیحت کی تھی کہ وہ ساتھ ساتھ رہا کریں، کیوں کہ اس زمانے میں جزیرے میں کئی بچوں کے گم ہو جانے کی خبریں سننے میں آئی تھیں اور معلوم ہوا تھا کہ بچوں کو پکڑے جانے والا کوئی گروہ جزیرے کے آس پاس آ گیا ہے۔ اس کے آدمی کسی وقت بھی وہاں آ کر بچوں کو پکڑ کر لے جا سکتے ہیں، اس لیے بڑی احتیاط سے رہنے کی ضرورت تھی۔ ایک روز پہلے سُنا گیا تھا کہ کسی امیر سوداگر کے نوعمر بیٹے کو اس گروہ کے آدمیوں نے اڑا لیا اور پولیس اس کو تلاش کرتی پھر رہی ہے، مگر کہیں پتہ نہیں چلا۔

یہ چاروں کمرے میں بیٹھی تھیں اور اسی لڑکے کے کھو جانے کی باتیں کر رہی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے سومو کو نیند آنے لگی۔ وہ لیٹ گئی۔ شوشو کی طبیعت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔

ماشا یہ سن کر خوف سے زرد پڑ گئی۔ اس کے منھ سے بات نہ نکلی، کیوں کہ اس کے دل میں خیال آیا ''سچ مچ کوئی کسی کونے میں چھپا نہ بیٹھا ہو، مگر وہاں کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔'' یہ دونوں واپس آنے لگیں تو انھوں نے دیکھا غار کی ایک دیوار کی سل کچھ ہلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ سونی نے اسے زور سے ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی۔ ایک آواز آئی، ''کون ہے؟'' دونوں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں اور خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ سونی عقل مند اور ہمت والی ضرور تھی، مگر اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ اس کی دو بہنیں اس سے عمر میں چھوٹی تھیں اور ایک بڑی۔ ماشا سونی سے دو سال چھوٹی تھیں۔ ذرا دیر میں اندھیرے میں ایک سایہ سا نظر آیا۔ سونی نے لال ٹین ہاتھ میں اوپر اٹھائی۔ سامنے پتھر کی دیوار کے اندر سے ایک بھاری بھر کم آدمی آتا دکھائی دیا۔ اب تو وہ دونوں ڈر کے مارے سہم گئیں اور جلدی سے پیچھے ہٹ کر باہر جانے لگیں۔ وہ غار کے دروازے سے نکل رہی تھیں کہ آنے والا آدمی ان کے پاس پہنچ گیا اور ہنس کر ان سے پوچھنے لگا ''تم یہاں سیر کے لیے آئی ہو؟'' ماشا تو کانپ رہی تھی، سونی نے ہمت کر کے کہا: ''جی ہاں، یوں ہی ہم باہر ٹہل رہی تھیں، ذرا دیکھنے اندر آ گئیں۔''

اس نے کہا: ''کوئی بات نہیں، میں تو سمندر سے موتی، سیپیاں اور گھونگے نکال کر بیچتا ہوں۔ کبھی یہاں بھی آ نکلتا ہوں کہ شاید سمندر اپنا کوئی خزانہ ادھر اُگل دے اور ہاتھ آ جائے۔ آیئے میں آپ کو سیر کراؤں۔'' سونی نے سر ہلاتے ہوئے جلدی سے کہا: ''جی نہیں، شکریہ۔ بس ہم جا رہے ہیں اب۔''

آدمی ہنستا ہوا اندر چلا گیا اور دونوں بہنیں تیز قدموں سے گھر کی طرف چلی گئیں۔

سونی کے لیے یہ معاملہ بڑا پُراسرار تھا۔ اس کو ڈر بھی لگ رہا تھا اور اس معاملے کا کھوج بھی لگانا چاہتی تھی۔ آخر اس کے ڈر پر یہ شوق غالب آ گیا کہ کسی طرح یہ پتا چلایا جائے کہ یہ کون آدمی تھا اور اس کا کشتی کی روشنی اور ساحل کے اشاروں سے کیا واسطہ ہے۔

کئی دن گزر گئے۔ ان دونوں بہنوں کے سوا اس بات کی گھر میں کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ سونی سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ ایک دن شام کو کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے اس نے پھر دیکھا کہ سمندر میں دور سے کشتی آ رہی ہے اور ساحل اور کشتی کے درمیان دور دور سے روشنی کے اشارے ہو رہے ہیں۔ انھیں دنوں اخبار میں خبر چھپی تھی کہ لڑکے کو جس گروہ نے اغوا کیا تھا، اس کی طرف سے لڑکے کے باپ کو خط ملا ہے کہ پچیس ہزار اشرفیاں دو تو تمھارا لڑکا مل جائے گا اور اخبار میں اقرار چھپوا دو تو ہم اپنا آدمی کسی جگہ بھیج کر اشرفیاں منگوا لیں گے۔ سونی کے دل میں ان روشنیوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ اگر مجھے اس گروہ کا پتا مل جائے اور میں اس لڑکے کو چھڑا لوں تو کیسا مزہ آ جائے۔ اس کے ماں باپ کتنے خوش ہوں گے۔

دوپہر کو کھانا کھا کر سب لوگ سونے کو لیٹ گئے۔ سونی اپنے ساتھ ماشا کو لے کر ساحل پر چلی گئی۔ یہ دونوں وہاں ٹہل رہی تھیں کہ سمندر میں زور کا طوفان آ گیا اور انھیں وہاں سے بھاگ کر گھر آنا پڑا، مگر تھوڑی دیر بعد جب طوفان کا شور ہلکا ہوا تو سونی پھر جانے لگی۔ ماشا نے اسے منع کیا کہ طوفان آیا ہوا ہے۔ اس وقت جانا ٹھیک نہیں، مگر وہ نہ مانی اور ماشا سے کہا: ”تم لالٹین روشن کر کے لے چلو۔ ذرا غار کے اندر چلیں گے۔“ ماشا جانتی تھی سونے ضد کی پکی ہے۔ اسے سونی سے بہت پیار بھی تھا، اس لیے وہ اسے تنہا چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ آخر دونوں لالٹین لیے وہاں پہنچیں، مگر چٹان کے پاس انھیں باہر ہی وہ آدمی مل گیا جو پہلے غار کے

اندر ملا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر واپس ہونے لگیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو مخاطب کیا،
''آیئے، آپ واپس کیوں جانے لگیں؟''

سونی نے کہا: ''کچھ نہیں ذرا طوفان کو دیکھنے آئے تھے۔ اب جا رہے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا: ''اچھا، خدا حافظ! میں بھی اسی لیے یہاں آیا تھا کہ شاید طوفان میں سمندر کے کچھ خزانے ادھر بکھر گئے ہوں، مگر یہاں ایک سیپ تک بھی نہیں ملی۔'' اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت گھبرایا ہوا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ یہ لڑکیاں وہاں سے جلدی چلی جائیں۔ سونی نے ایک بار اس کے لباس کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور ماشا کو لے کر گھر واپس آ گئی۔

دونوں اندر پہنچیں اور سونی کھڑکی کے پاس جا بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد وہی آدمی کشتی میں بیٹھ کر دوسری طرف جانے لگا۔ وہ اک دم کھڑکی سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور بولی: ''تم نے دیکھا نہیں وہاں کتنا پانی بھرا ہوا ہے۔'' سونی بولی ''تو کیا ہوا؟ کیا میں تیرنا نہیں جانتی، بس ابھی آتی ہوں۔'' اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ماشا دیکھتی رہ گئی اور جلدی میں اس کے ساتھ جانے بھی نہ پائی۔ سونی تیزی سے چل کر غار پر پہنچ گئی۔ اندر پانی بھرا تھا، مگر غار ایک لمبی چوڑی کوٹھری کی طرح بہت گہرا تھا۔ سونی کے دل میں نہ جانے کیا سمایا کہ وہ اک دم پانی میں کود کر تیرتی ہوئی غار کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ وہاں پانی بالکل نہ تھا، کیوں کہ غار کا دہانہ ڈھلوان تھا اور اندر کی جگہ بہت اونچی تھی، وہاں تک پانی نہ پہنچ سکتا تھا۔ سونی تیر کر جب اندر پہنچی تو وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ وہاں ایک طرف کا پتھر کچھ ہٹا ہوا نظر

آیا۔ اس نے اسے پکڑ کر زور سے کھینچا، وہ ہٹ گیا۔ سونی نے دیکھا کہ اندر ایک تہہ خانہ سا تھا اور وہاں ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی اور لڑکا ڈر کے مارے اس کو دیکھتے ہی رونے لگا۔ سونی نے لڑکے کو تسلی دے کر چپ کیا اور اس سے پوچھا "تمھیں تیرنا آتا ہے۔" اس نے کہا: "ہاں۔" سونی نے کہا: "تو آؤ جلدی میرے ساتھ باہر چلو، میں تم کو تمھارے گھر پہنچا دوں گی۔" لڑکا گھر کا نام سن کر سونی کے گلے لپٹ گیا۔ سونی لڑکے کو لے کر خوشی خوشی باہر نکلی اور دونوں تیرتے ہوئے ساحل پر پہنچ گئے۔ وہاں سے سونی لڑکے کو اپنے گھر لے آئی۔ سونی کی خالہ اور بہنیں سونی کا یہ کارنامہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور بہت خوش تھے۔ لڑکے سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہی امیر آدمی کا بیٹا ہے، جس کے لیے بچے اڑانے والے گروہ نے پچیس ہزار اشرفیاں مانگی تھیں۔ سونی کی خالہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سونی کی خیریت ہوئی اور کوئی ڈاکو اس وقت نہ آ گیا۔ انھوں نے پولیس کو خبر کر دی۔ لڑکے کے ماں باپ کو بلایا گیا۔ وہ بے حد خوش تھے اور سونی کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے لڑکے کو اپنے ساتھ لے گئے۔ پولیس افسر نے اپنے آدمیوں کو خفیہ طور پر گھات میں لگا دیا۔ شام کو ڈاکو غار میں پہنچے۔ کیوں کہ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ دن کو کیا ہوا، تو گرفتار کر لیے گئے۔ سونی کی بہادری اور عقل مندی کی دھوم مچ گئی۔ سرکار کی طرف سے بھاری انعام ملا۔ لڑکے کے والدین نے بھی تحفے بھیجے۔ اخباروں میں اس کی تصویر چھپی۔ سب نے سونی سے پوچھا کہ تمھیں اس لڑکے کے غار میں ہونے کا کیسے خیال ہوا تو اس نے بتایا کہ مجھے یہ تو نہیں معلوم تھا کہ لڑکا یا کوئی اور غار میں بند ہے، مگر اس آدمی کے جوتے ربر کے نہیں تھے، جو سیپیاں اور موتی جمع کرنے والے پہنتے ہیں، اس لیے شبہ ہوا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، اس لیے اس غار کا بھید معلوم کرنا چاہتی تھی۔ ☆

میں پاکستانی فوجی ہوں

مجھے آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرا کام پاکستان کی حفاظت کرنا ہے۔ پاکستان کو اس کے دشمنوں سے بچانا اور اس زمین کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ یہ ایک ایسا فرض ہے جس کو ادا کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اس فرض کو میں صرف افسروں کے حکم سے ہی نہیں بلکہ اپنے دِل کے تقاضے سے بھی ادا کرتا ہوں۔ میں اپنے پیارے وطن کی حفاظت کے لیے جو کچھ بھی کرتا ہوں اُس سے میری روح خوش ہوتی ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ میرا کام تباہی پھیلانا، نقصان پہنچانا اور لڑائی کرنا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ میرا کام جنگ کو روکنا اور امن قائم کرنا ہے۔

بعض وقت امن قائم کرنے کے لیے جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ بعض وقت کوئی دوسرا ملک عقل سے کام نہیں لیتا۔ اس کی ہوس حد سے بڑھ جاتی ہے اور وہ دوسرے ملکوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے یا ان کو کم زور کر کے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور ان پر حملہ کر دیتا ہے تو میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں اس کا جواب دوں۔ اپنے ملک میں اس کو گھسنے نہ دوں اور اس کو ظلم و زیادتی کا مزہ چکھاؤں۔ اس وقت میں اپنی جان لڑا دیتا ہوں۔ مجھے امن کے زمانے میں لڑنے کی تربیت اسی لیے دی جاتی ہے کہ اگر لڑائی ضروری ہو جائے تو

پھر میں خوب لڑوں اور اپنی مہارت سے جنگ میں کام یابی اور فتح حاصل کروں۔ آپ کو معلوم ہے جب بھی ایسا موقع آیا ہے میں نے میرے ساتھیوں نے، میرے افسروں نے بے خوف ہو کر بڑی بہادری، حوصلے اور ہمت سے دشمن کا مقابلہ کیا ہے اور اس کو سبق سکھایا ہے اور بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ہم نے اپنی جانیں قربان کر کے اپنے پیارے پاکستان کا دفاع کیا ہے، حملہ آور کو کام یاب نہیں ہونے دیا ہے۔

میں اپنے ملک کی خدمت کے علاوہ اپنی قوم کی خدمت بھی کرتا ہوں۔ جنگ کے علاوہ امن کے زمانے میں جب کوئی ہنگامی صورت پیدا ہوتی ہے اور شہروں میں بھی میری ضرورت پڑتی ہے تو میں حاضر ہوتا ہوں۔ طوفانوں اور سیلابوں میں بھی میں ملک و قوم کی خدمت کر کے خوش ہوتا ہوں۔

مجھے وطن کی حفاظت کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ مجھے لڑنے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کا فن سکھایا جاتا ہے۔ مجھے بہترین ہتھیاروں کا استعمال بتایا جاتا ہے، لیکن مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نظم وضبط، حکم کی پابندی، وطن سے میری محبت، میرا ایمان، میرا جذبہ اور میرا کردار میری اصل طاقت ہے۔ ایمان اور کردار انسان کو جو قوت عطا کرتے ہیں وہ ہر قوت پر غالب آسکتی ہے۔

میں پاکستانی فوجی ہوں۔ مجھے یہ قوت حاصل ہے اور یہی میری کام یابی کی ضامن ہے۔

☆☆☆

دادا قیدی

کوشا ایک تاجر تھا۔ اس کا شمار شہر کے اچھے تاجروں میں ہوتا تھا۔ جب اسے ''راکسی گاؤں'' میں ہونے والے تجارتی میلے کی خبر ملی تو اس نے اپنی بیوی سے میلے میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ بیوی نے کوشا کو پہلے تو جانے کی اجازت دے دی، مگر دوسرے دن صبح کو جب کوشا سفر کی تیاری کر رہا تھا تو اس کی بیوی نے اس سے کہا: ''تم میلے میں نہ جاؤ۔ میں نے رات ایک بُرا خواب دیکھا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تمھیں یہ سفر راس نہیں آئے گا۔''

کوشا بیوی کی یہ بات سن کر ہنسا۔ وہ ایسی تمام باتوں کو بے کار اور مہمل سمجھتا تھا۔ اس نے بیوی سے کہا: ''یہ تمھارا خیال ہے۔ میرا میلے میں جانا ضروری ہے، مگر یہ تو بتاؤ، وہ خواب تھا کیا؟''

بیوی نے اسے خواب سنایا: ''میں نے دیکھا کہ تم میلے سے واپس آئے ہو۔ تمھارے یہ سیاہ خوب صورت بال سفید ہو گئے ہیں اور تمھارے چہرے پر بڑھاپے کی خزاں چھا گئی ہے۔''

اس نے بیوی کو تسلی دی: ''خواب سچ نہیں ہوتے۔ تم فکر نہ کرو۔ خدا نے چاہا تو یہ میلا میرے لیے اچھا ہی ثابت ہوگا۔''

پھر اس نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ راکسی گاؤں جانے کے لیے اسے بس

سے سفر کرنا تھا۔ بس دوسرے دن دوپہر کو راکسی گاؤں پہنچتی تھی اور رات میں چوں کہ بس سروس بند ہو جاتی تھی، اس لیے اسے رات ایک ہوٹل میں گزارنی پڑی۔ ہوٹل کے جس کمرے میں وہ ٹھیرا ہوا تھا، اس کے برابر والے کمرے میں ایک اور تاجر مقیم تھا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کافی پی اور شب بخیر کہہ کر ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ کوشا صبح سویرے اٹھا اور راکسی گاؤں جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ جب وہ راکسی گاؤں پہنچا تو ایک پولیس افسر چند سپاہیوں کو ساتھ لیے اس کے پاس آیا اور اس نے کوشا سے بہت سے سوال کر ڈالے: ''تم کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ تم نے رات کس ہوٹل میں گزاری تھی؟''

پہلے تو کوشا ان تمام سوالات کے پوچھنے کا مطلب نہ سمجھا اور نہ اس نے ان سوالات کو کوئی اہمیت دی، لیکن جب پولیس نے اس کے سامان کی تلاشی لی اور ایک چھرا خون میں لتھڑا ہوا اس کے سامان سے برآمد ہوا تو کوشا پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے پولیس سے پوچھا: ''آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

پولیس افسر نے کہا: ''تم خونی ہو۔ کل رات تم جس ہوٹل میں ٹھیرے تھے، تمھارے برابر والے کمرے میں جو تاجر تھا، وہ مردہ پایا گیا ہے۔ ہمیں تم پر شبہ ہے، چوں کہ تم ہی رات گئے تک اس کے ساتھ تھے۔''

پولیس افسر کوشا کو پولیس چوکی میں لے گیا اور اس پر خون کا مقدمہ چلا گیا۔ کوشا اور اس کی بیوی نے بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بہت کوشش کی، ثبوت بھی دیے، لیکن

عدالت نے کوشا کو قتل کے الزام میں پچیس سال قید کی سزا سنا دی۔ لیکن کوشا کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن سچائی لوگوں کے سامنے آئے گی۔ چوں کہ سچ کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے اور پھر خدا بھی تو سچائی کی دلیل ہے، پھر وہ کیوں سچ کو جھوٹ ہونے دے گا۔

دن گزرتے گئے۔ کوشا کو جیل میں بیس سال بیت گئے۔ اس کا چہرہ کمھلا گیا۔ اس کے خوب صورت سیاہ بال سفید ہو گئے اور اس کے چہرے پر بڑھاپے کی خزاں چھا گئی۔ ایک رات ایک نیا قیدی جیل میں لایا گیا۔ قیدیوں نے اس نئے قیدی سے اس کے جرم کے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا: ''میں نے ایک بار ایک بڑا جرم کیا تھا، لیکن پولیس میرا کچھ نہ کر سکی تھی۔ اس بار میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور پولیس نے مجھے جیل بھیج دیا۔''

نئے قیدی کی یہ باتیں بوڑھا کوشا بھی سن رہا تھا، جسے اب سب قیدی دادا کہتے تھے۔ اس نے پوچھا: ''وہ بڑا جرم کیا تھا؟'' نئے قیدی نے کہا: ''آج سے بیس سال پہلے میں نے ایک گاؤں میں ایک تاجر کا قتل کیا تھا، لیکن اس جرم میں پولیس مجھے گرفتار نہ کر سکی اور ایک دوسرے آدمی کو جو تاجر تھا، قتل کے الزام میں پکڑ لیا۔''

کوشا نئے قیدی کی یہ بات سن کر چونک پڑا اور اسے بیس سال پہلے کا قتل کا وہ واقعہ یاد آ گیا، جس کے جرم میں وہ پکڑ لیا گیا تھا۔ کوشا کو یقین ہو گیا کہ یہ نیا قیدی وہی اصلی قاتل ہے، جس نے اس تاجر کا خون کیا تھا۔ یہ یقین اس وقت اور بھی پکا ہو گیا جب کوشا نے اس قیدی کو اپنا نام اور اپنے وطن کا نام بتایا، جس کو سن کر نئے قیدی کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، لیکن کوشا نے اس نئے قیدی سے کچھ نہیں کہا۔

دن گزرتے گئے۔ ایک رات کوشا نے دیکھا کہ وہ نیا قیدی جیل کی دیوار میں

سوراخ کر رہا ہے۔ کوشا کو دیکھ کر پہلے تو نیا قیدی سہم گیا، پھر وہ کوشا کے قریب آیا اور بولا: ''تم بھی میری مدد کرو۔ ہم دونوں یہاں سے بھاگ جائیں گے۔'' لیکن کوشا کو اس طرح جیل سے بھاگنا پسند نہیں تھا۔ اس نے انکار کر دیا اور اپنے بیرک میں واپس لوٹ آیا۔ صبح جب جیلر کو یہ معلوم ہوا کہ جیل کی دیوار میں سوراخ کیا گیا ہے تو اس نے تمام قیدیوں کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ یہ حرکت کس نے کی، لیکن کوئی قیدی صحیح جواب نہ دے سکا۔ جیلر نے کوشا سے پوچھا: ''تم بتاؤ، رات جیل کی دیوار میں سوراخ کس نے کیا اور کون یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا؟ ہمیں تمھاری سچائی اور دیانت داری پر بھروسا ہے کہ تم سچ سچ بات ہمیں بتاؤ گے۔''

اور واقعی کوشا کی سچائی اور دیانت داری ساری جیل میں مشہور تھی۔ اس نے اس نئے قیدی کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں رحم کی درخواست تھی، جو کہہ رہی تھیں، خدا کے لیے کہہ نہ دینا، ورنہ میں مارا جاؤں گا۔ کوشا کو اس نئے قیدی کی حالت پر ترس آیا۔ اس نے سوچا، اگر میں کہہ بھی دوں تب بھی میرا کیا فائدہ ہوگا، اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ کوشا نے جواب دیا: ''مجھے نہیں معلوم یہ کام کس کا ہے۔'' اور اس طرح وہ نیا قیدی بچ گیا۔

رات کو وہ نیا قیدی اس کے پاس آیا اور اس کے قدموں پر گر پڑا اور زور زور سے رونے لگا: ''دادا! مجھے معاف کر دو۔ وہ خون میں نے کیا تھا۔ میں نے وہی چھرا تمھارے سامان میں چھپایا تھا۔ تم نے میرا راز نہ کہہ کر مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ تم نے مجھ میں سوئی ہوئی انسانیت جگا دی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اب کبھی برائی نہیں کروں گا۔ میں ایک اچھا انسان بنوں گا۔'' دادا قیدی مسکرایا۔ وہ اگر تباہ ہو گیا تو کیا ہوا، اس کی تباہی نے ایک انسان کو انسان بنا دیا، اس کی زندگی بے کار نہیں گئی۔ ☆

کھو گیا ہزار رُپے کا نوٹ

رشید واقعی بہت پریشان تھا۔ گھر لوٹتے ہوئے اس نے نہ دائیں طرف دیکھا نہ بائیں طرف۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس کے لب خاموش تھے۔

یہ جمعرات کا دن تھا اور اگلی پیر کو اسے وہ رقم جمع کرانی تھی، جو اُسے اخبار کے خریداروں سے وصول ہوتی تھی اور ایک ہفتے کے بعد ہر پیر کو اخبار کی ایجنسی کے دفتر میں جمع کرانا پڑتی تھی اور اس کے پاس ہزار رپے کم تھے۔

اس نے جن لوگوں سے رقم وصول کی تھی، اُن میں سے ایک ایک کو دل میں یاد کیا اور سوچا کہ آخر یہ کمی کیسے واقع ہوئی۔ بدھ کی رات کو خوب بارش ہو رہی تھی۔ بھیگ جانے کے خدشے کی وجہ سے اس نے وقت سے پہلے ہی کام ختم کر دیا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے ایک خاتون کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا جس نے اُسے ہزار رپے کا نوٹ دیا تھا اور بقیہ رقم رشید نے اُسے واپس کر دی تھی۔ یہ بات اسے اچھی طرح یاد تھی، لیکن جب گھر پہنچا تو اسے وہ نوٹ نہیں ملا۔

وہ ہمیشہ اخبار کی رقم سیدھے ہاتھ کی جیب میں رکھتا تھا اور اپنی ذاتی رقم بائیں جیب میں۔ نوٹ ان دونوں جیبوں میں نہیں تھا اور جیبیں صحیح سالم تھیں۔

شام کو اس کے اسکول کا ساتھی رفیق اس کے گھر آیا اور پوچھا کہ کل اسکول میں گھر

کے لیے کیا کام دیا گیا ہے؟ رفیق اپنی ماں کے ساتھ ایک شکستہ جھونپڑی میں رہتا تھا۔ رفیق کی ماں گھروں میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ رفیق بہت دبلا پتلا لڑکا تھا، اچھا کھانا تو کیا اُسے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔

رشید کو یاد آیا کہ بدھ کے روز رات کو دودھ والے کی دکان پر وہ گرم گرم دودھ پی رہا تھا، تا کہ گھر جانے سے پہلے اپنے بدن کو گرمی پہنچائے تو رفیق اس وقت اس کی دائیں طرف اس سے بالکل بھڑا ہوا کھڑا تھا۔ اسی طرف وہ اخبار کی رقم رکھتا تھا۔ اس کے دل میں رفیق کی طرف سے کچھ شبہ پیدا ہوا۔

جمعہ کی صبح کو اس کا شبہ بڑھ گیا، کیوں کہ رفیق جب اسکول آیا تو وہ ایک بہت عمدہ اور نیا سوئٹر پہنے ہوئے تھا۔

شبہ کا کھوج لگانے کے لیے رشید کو ایک تدبیر سوجھی۔ اگرچہ اس میں کام یابی کی امید بہت کم تھی، پھر بھی اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

رشید کی ریاضی بہت اچھی تھی اور رفیق انگریزی میں بہت اچھا تھا۔ اس نے رفیق سے کہا: ''اگر تم شام کو میرے گھر آ جایا کرو تو میں ریاضی میں تمھاری مدد کر دیا کروں گا اور تم انگریزی میں میری مدد کر دیا کرو۔'' رفیق بہت خوشی کے ساتھ رضا مند ہو گیا۔

پڑھائی شروع کرنے سے پہلے اسکول کے دونوں ساتھیوں نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ رفیق نے کہا: ''میرے والد مرحوم اسکول میں ٹیچر تھے۔ انھوں نے مجھے انگریزی سکھانے کے لیے بہت محنت کی تھی، لیکن ریاضی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ پچھلے سال ان کا انتقال ہو گیا اور ہم سخت مصیبت کا شکار ہو گئے۔ میری والدہ یہ چاہتی ہیں

کہ میں اپنے والد کی طرح کالج میں پڑھوں۔ وہ بہت مشقت کر کے رُپے جمع کر رہی ہیں، تا کہ میں کالج میں داخلہ لے سکوں۔''

اب رشید سوچ رہا تھا کہ میں نے رفیق پر شبہ کرنے میں بڑی غلطی کی، لیکن دوسرے لمحہ اسے خیال آیا کہ جب رفیق اتنا مفلس ہے تو اس کے پاس اتنا اچھا سوئٹر کہاں سے آیا؟

رشید نے سوال کیا: ''یہ سوئٹر تم نے کتنے میں خریدا ہے؟ مجھے بہت پسند ہے، میں بھی خریدوں گا۔''

رفیق نے کہا: ''یہ میں نے خریدا نہیں ہے۔ ہمارے محلّہ میں بیگم اشفاق رہتی ہیں، یہ انھوں نے اپنے بیٹے کے لیے بُنا تھا، لیکن چھوٹا ہو گیا تو انھوں نے میری والدہ کو دے دیا۔''

رفیق نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ مجھے بھی تمھاری طرح کوئی کام مل جائے، لیکن میرے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ مجھے سوئٹر تو مل گیا، لیکن میرے پاس پاجامہ نہیں ہے اور یہ پاجامہ تارتار ہو رہا ہے۔''

رشید نے دل میں سوچا کہ میں رفیق کے مقابلے میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ میرے پاس تین نئے سوٹ ہیں۔ ایک پتلون میرے پاس تھی، جو چھوٹی ہوگئی ہے، وہ رفیق کے بالکل ٹھیک آئے گی۔''

اس نے کہا کہ میرے پاس ایک پتلون ہے، جو میرے لیے چھوٹی ہوگئی اور تمھارے ٹھیک آئے گی، وہ تم لے لو۔''

رفیق نے کہا: ''اس سے اچھی کیا بات ہے۔ اب میں امید کرتا ہوں کہ مجھے کوئی کام

مل جائے گا اور کام مل جانے کے بعد میں تمھیں اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔''

رشید نے کہا: ''مجھے یقین ہے کہ میری والدہ تم سے اس کی قیمت ہرگز نہیں لیں گی۔ اگر وہ پتلون تمھارے ٹھیک آ جائے تو تمھاری نذر کر کے انھیں بہت خوشی ہوگی۔

پتلون رفیق نے پہنی تو اس کے بالکل ٹھیک آئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے مسرت سے اپنا سینہ تان لیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر اکڑ کے کھڑا ہو گیا۔ رشید بھی بہت خوش تھا۔

رفیق نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اُسے اس کے اندر کوئی سخت سا کاغذ محسوس ہوا۔ اس نے اس تہ کیے ہوئے کاغذ کو باہر نکال کر کھولا تو اس میں ایک ہزار روپے کا نوٹ نکلا۔ بارش کے دن رشید یہی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ رفیق نے کہا: ''اچھا ہوا کہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھ لیا، ورنہ تم یہ سمجھتے کہ تمھارا یہ نوٹ کہیں کھو گیا۔''

رشید کو اس نوٹ کے مل جانے سے بڑی خوشی ہوئی، مگر دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ اب اسے خیال آیا کہ اس کا کوٹ بارش سے بھیگ گیا تھا، اس لیے اس نے اس نوٹ کو بھیگ جانے سے بچانے کے لیے پتلون میں رکھ لیا۔ رشید دل میں سوچ رہا تھا کہ کتنا اچھا ہوا کہ میں نے رفیق سے اس نوٹ کے معاملہ میں اپنے شبے کا اظہار نہیں کیا۔ ☆

تیسرے جہاز کے بعد

ایک نوجوان کو جس کا نام ڈوبری وے تھا، اس کی سال گرہ پر ایک بہت خوب صورت بادبانی جہاز تجارتی مال سے لدا ہوا تحفے میں دیا گیا۔

ڈوبری وے کے باپ نے اس سے کہا: ''بیٹے! تمھاری تعلیم و تربیت ختم ہوگئی ہے۔ اب تم قسمت آزمائی کے لیے دنیا میں جاؤ۔ اب تک تمھاری سب باتیں پسندیدہ اور قابلِ اطمینان رہی ہیں۔ تم محنتی ہو اور سمجھ دار ہو۔ مجھے تم پر بھروسا ہے کہ تم اس مال سے تجارت کر کے فائدہ اٹھاؤ گے، جاؤ، خدا تمھاری مدد کرے گا۔''

ڈوبری وے نے باپ کا شکریہ ادا کیا اور اپنے خوب صورت بادبانی جہاز پر روانہ ہو گیا۔ ابھی اس کے جہاز نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اُسے ترکوں کا ایک جہاز ملا۔ جب وہ جہاز قریب آیا تو اس میں سے رونے اور آہ وزاری کرنے کی آوازیں آئیں، ڈوبری وے نے زور سے چیخ کر ترک کپتان سے کہا: ''میرے دوست! تمھارے جہاز سے یہ رونے کی آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟ کیا کچھ لوگ بیمار ہیں یا کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟''

ترک کپتان نے جواب دیا: ''یہ ہمارے قیدیوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں ہیں۔ یہ سب غلام ہیں۔ ہم انھیں اپنے ساحل پر پہنچ کر فروخت کر دیں گے۔''

ڈوبری وے نے کہا: ''ذرا اپنا جہاز روکو۔ ممکن ہے، ہم سے ہی سودا ہو جائے۔''

ٹرک کپتان، ڈوبری وے کے جہاز میں آیا، اس کا تجارتی مال دیکھا اور فوراً ڈوبری وے کے جہاز کو اپنے جہاز سے بدلنے پر تیار ہو گیا۔

ڈوبری وے نے ترکی جہاز پر پہنچتے ہی ہر قیدی سے پوچھا کہ اس کا گھر کہاں ہے؟ اس کے بعد اس نے سب قیدیوں کو اُن کے وطن پہنچا دیا، لیکن ایک نوجوان کنواری لڑکی اور اس کے ساتھ بوڑھی ماما، یہ دو ایسے قیدی تھے جن کو وہ ان کے وطن نہ پہنچا سکا، کیوں کہ وہ بہت دور تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ زار روس کی لڑکی ہے اور یہ بوڑھی عورت اس کی نرس ہے۔ لڑکی نے یہ بھی کہا کہ ہم اب محنت کر کے اپنا پیٹ پالیں گے۔

ڈوبری وے نے لڑکی سے کہا: ''اگر تم مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو جاؤ تو پھر تمھیں کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہر طرح تمھیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔''

لڑکی اس کی خدا ترسی اور رحم دلی پر پہلے ہی سے فدا تھی، اس نے ڈوبری وے کی درخواست منظور کر لی اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

ڈوبری وے جب اپنا جہاز لے کر اپنے وطن پہنچا تو اس کا باپ ساحل پر ہی موجود تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو لینے وہاں آیا تھا، مگر اس کی خوشی خاک میں مل گئی، جب اس کے بیٹے نے کہا: ''ابا جان! آپ نے جو رُپیہ مجھے دیا تھا، اُسے میں نے بہت عقل مندی کے ساتھ صرف کیا ہے۔ میں نے بہت سے مصیبت کے مارے لوگوں کو ان کی پریشانی اور مصیبت سے نجات دلائی۔ اس کے علاوہ میں ایک حسین اور نیک سیرت لڑکی سے شادی کر کے اُسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ وہ جہازوں کے پورے بیڑے سے زیادہ بیش بہا ہے۔''

باپ یہ ساری داستان سن کر بہت ناراض ہوا۔ وہ لڑکی سے بھی اخلاق کے ساتھ پیش نہیں آیا اور کہنے لگا: ''تم نے فضول اتنی دولت برباد کردی، تم بڑے بے وقوف نکلے۔''

کچھ مدت بعد ڈوبری وے کے باپ نے سوچا کہ ایک دفعہ حماقت کرکے وہ سبق حاصل کر چکا ہے۔ اب وہ ضرور تجارت میں کام یابی حاصل کرے گا، چناں چہ اس نے ایک دوسرا جہاز قیمتی سامان سے بھر کر اس کے حوالے کیا۔

ڈوبری وے اپنے باپ اور اپنی بیوی سے رخصت ہو کر روانہ ہوا اور یہ ارادہ کر لیا کہ اس سامان کی تجارت سے وہ بہت نفع حاصل کرکے واپس آئے گا۔

مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب پہلی ہی بندرگاہ پر اس نے لنگر ڈالا تو اس نے دیکھا کہ سپاہیوں نے بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر رکھا ہے اور قیدیوں کے بیوی بچے دھاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ ایک ظالمانہ ٹیکس ادا نہیں کر سکے ہیں۔ ڈوبری وے نے اپنا تمام سامان فروخت کرکے ان کا ٹیکس ادا کر دیا اور ان کو سپاہیوں کے پنجے سے چھڑا لیا۔ اس مرتبہ ڈوبری وے کا باپ اپنے بیٹے سے اس قدر ناراض ہوا کہ اُس نے ڈوبری وے، اس کی بیوی اور بوڑھی نرس کو اپنے گھر سے نکال دیا اور ان سے کہہ دیا کہ اب میں تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ ایک پڑوسی نے ان تینوں کو رہنے کے لیے اپنے گھر میں جگہ دے دی اور کچھ عرصے بعد باپ بیٹے میں ملاپ کرا دیا۔

بوڑھے باپ نے اپنے بیٹے کو ایک آخری موقع دینے کا ارادہ کیا۔ اُس نے تیسرا

گا۔ تم فوراً اپنے گھر جاؤ اور شہزادی کو اور اپنے ماں باپ کو یہاں لے آؤ۔"

زار نے اپنے وزیراعظم کو اس کے والدین کے لیے تحفے تحائف دے کر ڈوبری وے کے ساتھ بھیجا۔

اس مرتبہ ڈوبری وے کا باپ بہت خوش ہوا اور اپنے بیٹے کی اس نے بہت تعریفیں کیں اور سارا خاندان بہت مسرت اور خوشی کے ساتھ روس کے لیے روانہ ہو گیا۔

ان لوگوں کے روس پہنچنے پر اور شہزادی کے مل جانے کا بہت اعلا پیانے پر جشن منایا گیا اور جب شہزادی نے ڈوبری وے کی رحم دلی اور خدا ترسی کے واقعات اپنے باپ کو سنائے تو وہ بہت متاثر ہوا اور اپنا تخت و تاج ڈوبری وے کے سپرد کر کے سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ڈوبری وے نے تخت و تاج پا کر خلق خدا کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی رعایا بہت خوش حال ہو گئی اور ہر شخص کے دل سے ڈوبری وے کے لیے دعائیں نکلنے لگیں۔ ☆

غریب ہی اچھا

ایک آدمی دولت کمانے کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہالینڈ گیا۔ وہ ہالینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈم پہنچا۔ اس شہر میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے اس نے ایک بہت عالی شان عمارت دیکھی۔ بہت دیر تک وہ عمارت کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ یہ کس شخص کا مکان ہے؟ کون خوش قسمت شخص اس میں رہتا ہوگا؟ وہ کتنا مال دار ہوگا؟ ایک آدمی قریب سے گزر رہا تھا۔ مسافر نے اس آدمی سے پوچھا کہ یہ کس کا مکان ہے تو اس آدمی نے کہا: ''کے نی ٹوورس ٹن۔''

ہالینڈ کی زبان میں اس کا مطلب ہے: ''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔'' لیکن مسافر یہ زبان نہیں جانتا تھا، اس لیے اس نے سمجھا کہ شاید یہ مکان مالک کا نام ہے۔

اس آدمی کی خواہش اور بھی بڑھ گئی کہ چھوٹی موٹی نوکری یا محنت مزدوری کرنے کے بجائے کوئی بڑا کام کرے، خوب کمائے اور بہت ساری دولت جمع کرے۔ اس فکر میں اس نے اور زیادہ کوشش شروع کر دی۔ ایک دن وہ سمندر کے کنارے پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا جہاز گودی پر لگا ہوا ہے اور ہزاروں مزدور سامان اُتار رہے ہیں۔ مسافر نے ایک آدمی سے پوچھا:

''یہ جہاز کس کا ہے؟''

جواب ملا: ''کے نی ٹوورس ٹن'' (میں آپ کی بات نہیں سمجھا) مسافر نے پھر

یہی سمجھا کہ یہ جہاز کے مالک کا نام ہے۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ "کے نی ٹو ورس ٹن" کتنا بڑا رئیس ہے، جو چیز دیکھو اسی کی ہے۔

کچھ دن بعد مسافر نے دیکھا کہ ایک جنازہ جا رہا ہے۔ ہزاروں آدمی جنازے کے جلوس میں شریک ہیں۔ سیاح سمجھ گیا کہ کوئی بڑا آدمی مر گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس آدمی کا نام معلوم کرنا چاہیے۔

جب اس نے کسی سے پوچھا تو وہی جواب ملا: "کے نی ٹو ورس ٹن۔"

سیاح کو بہت رنج ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ دیکھو، کوئی آدمی کتنا ہی بڑا ہو، کتنی ہی دولت اور جائیداد کا مالک ہو، موت سے نہیں بچ سکتا۔ تو پھر مال و دولت اِکھٹا کرنے سے کیا فائدہ؟ اب اس آدمی کو دیکھو، سارا مال و متاع دوسروں کے لیے چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ میں خواہ مخواہ دولت کمانے کی فکر میں ملکوں ملکوں گھوم رہا ہوں۔ مال دار بننے کی خواہش نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔

نہیں، اب میں لالچ نہیں کروں گا اور جو کام بھی کروں گا، محنت سے کروں گا اور بس اتنا کماؤں گا کہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکوں اور عزت سے رہ سکوں۔ محنت اور ایمان داری سے کما کر کھانے میں ہی زندگی مزے سے گزرتی ہے۔ ☆

☆ صرف اعتماد ہی ہمارا حقیقی رہبر ہے، جو ہمیں اپنی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔
☆ اعمال کی آواز الفاظ سے بلند ہوتی ہے۔
☆ مفلسی باعثِ شرم نہیں ہے، لیکن مفلسی کی وجہ سے شرمندہ ہونا شرم کی بات ہے۔
☆ اپنے آپ کو اس وقت تک انسان نہ سمجھو، جب تک تمھاری رائے تمھارے غصے کے زیرِ اثر ہے۔